بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# لمعات

## سیکولر اسٹیٹ یا دینی ریاست؟

یہ آواز اب دنیا کے ہر گوشے سے سنائی دیتی ہے کہ مذہب کو سیاست سے کیا واسطہ؟ اور حامیانِ مذہب کے ہاں سے اس کا کوئی اطمینان بخش جواب نہیں ملتا۔ بات ہے بھی ٹھیک۔ ایک شخص صبح اٹھ کر' رام نام جپتا' اور کرشن مہاراج کی پوجا کرتا ہے۔ دوسرا گرجا میں جا کر کچھ مقدس گیت گا لیتا ہے۔ تیسرا مسجد میں خدا کے حضور سجدہ گزارتا ہے۔ اس کے بعد تینوں اقوام متحدہ کے ایوان میں پہنچ کر اس مسئلہ پر غور کرتے ہیں کہ عراق یا شمالی کوریا کے معاملہ میں ہمیں کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہئے۔ وہاں یہ تینوں اپنے اپنے نقطۂ نگاہ سے اور اپنی اپنی مملکت کے مصالح کے پیشِ نظر' اس بحث میں حصہ لیتے ہیں اور اس پر نہ رام نام کی مالا اثر انداز ہوتی ہے نہ گرجا کے مقدس گیت۔ نہ ہی وہاں مسجد میں سجدہ ادا کرنے والے کی نماز ہی اپنا کوئی امتیازی نشان دکھاتی ہے۔ اس سے انسان لامحالہ اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ سیاست میں مذہب کا کوئی دخل نہیں۔ مذہب خدا اور بندے کے درمیان ایک پرائیویٹ تعلق کا نام ہے جس کا مقام پرستش گاہوں کی چار دیواری کے اندر ہے۔ امورِ سیاست کے فیصلے مملکتوں کی مصلحتوں کے مطابق طے پاتے ہیں اور انہیں اسی طرح طے بھی پانا چاہئے۔ چنانچہ دنیا کی سیکولر حکومتوں میں مذہبی فرائض و رسوم اپنی جگہ ادا ہوتے رہتے ہیں اور امورِ سلطنت اپنے طور پر سرانجام پاتے جاتے ہیں۔ دونوں کے دوائر الگ الگ ہیں جن میں سے کوئی ایک دوسرے میں دخیل نہیں ہوتا اور انسانی معاشرہ ''بخیر و خوبی'' آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے' حامیانِ مذہب کی طرف سے اس اعتراض کا کوئی اطمینان بخش جواب بن نہیں پڑتا۔ اس کا نتیجہ ہے کہ مذہب نے اب آہستہ آہستہ اپنے آپ کو سمیٹ لیا ہے اور سیکولر نظامِ حکومت دنیا کا عام چلن ہوتا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کا قدامت پرست طبقہ بھی اسلام کو' منجملہ مذاہبِ عالم' ایک مذہب ہی سمجھتا ہے۔ اس لئے عملاً اس کی پوزیشن بھی دیگر اہلِ مذاہب سے مختلف نہیں۔ البتہ وہ یہ مطالبہ پیش کرتا ہے کہ

جن قوانین کو اس نے 'قوانین شریعت' کا نام دے رکھا ہے' انہیں علیٰ حالہٖ قائم رکھا جائے۔ لیکن چونکہ یہ قوانین' جنہیں آج سے صدیوں پہلے کے قانون دان حضرات فقہا نے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق مرتب کیا تھا' زمانہ حاضرہ کے مقتضیات کا ساتھ نہیں دیتے' اس لئے مسلمان حکومتیں عموماً انہیں خیر باد کہنے پر مجبور ہو رہی ہیں' اس لئے عملاً ان کا مؤقف بھی سیکولر ہوتا چلا جا رہا ہے۔

لیکن قرآن کا تقاضا کچھ اور ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اسلام' مذہب نہیں' دین ہے۔ اور اگر دین کو سیاست سے الگ کر دیا جائے تو دنیا میں فساد ہی فساد برپا ہو جاتا ہے۔ دین نام ہے زندگی کے غیر متبدل اصولوں کا اور ان اصولوں پر اپنے اپنے زمانے میں عمل پیرا ہونے کو شریعت کہا جاتا ہے۔ مسلمان کا ایمان یہ ہے کہ زندگی کے یہ اصول کسی حالت میں بھی بدل نہیں سکتے' اور امور سیاست کا فیصلہ ان اصولوں کے مطابق ہوگا۔ حکومت کی مصلحتیں ان اصولوں پر کبھی بھی اثر انداز نہیں ہو سکتیں۔ اگر کوئی حکومت ان اصولوں کو نظر انداز کر دیتی ہے تو اسے اسلامی حکومت نہیں کہا جائے گا۔ نہ ہی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا ہے جو ان اصولوں کے حیطۂ اقتدار سے باہر ہو۔ جب سیاست دین کے تابع ہوگی تو اس وقت امور مملکت کس طرح طے پائیں گے' اس کا اندازہ ایک مثال سے لگائیے۔ جب عراق کا مسئلہ' اقوام متحدہ کے ایوان میں پیش ہوگا تو ہر ایک مملکت کا نمائندہ اس پر اپنی اپنی مملکت کے مصالح کی روشنی میں غور کرے گا۔ لیکن دین پر مبنی مملکت کے نمائندہ کے سامنے اصول یہ ہوگا کہ۔

لا یجرمنکم شنان قوم علیٰ ان لا تعدلوا۔ اعدلوا۔ ھو اقرب للتقویٰ۔

دیکھنا! کوئی قوم اگر تمہاری دشمن بھی ہے تو اس کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کر دے کہ تم اس کے معاملہ میں عدل سے کام نہ لو۔ ہمیشہ عدل کرو۔ کیونکہ یہ بات تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔

یہ نمائندہ وہاں یہ نہیں دیکھے گا کہ میری مملکت کا فائدہ کس میں ہے۔ وہ یہ دیکھے گا کہ عدل کا تقاضا کیا ہے اور وہ اسی کے مطابق رائے دے گا۔ خواہ یہ چیز خود اس کی اپنی مملکت کے بھی خلاف کیوں نہ جائے (ولو علیٰ انفسکم۔ ۴/۱۳۵)۔ اس نے جو صبح خدا کے حضور سر جھکایا تھا تو وہ اس حقیقت کے اظہار کی علامت کے طور پر تھا کہ ہم ہر معاملہ میں ترے قوانین کی اطاعت کریں گے۔

اب آپ سوچئے کہ کیا اس دین کو سیاست سے کوئی تعلق ہے یا نہیں؟ سیاست کو اس دین کے تابع رکھنے سے یہ

دنیا کس طرح جنت بداماں ہو جائے گی' اس کا اندازہ تو شاید ہم نہ لگا سکیں ( کیونکہ ہم نے ایسا فردوس آگیں منظر کبھی دیکھا نہیں ) لیکن سیاست کے اس دین سے الگ ہو جانے سے انسانیت جس طرح جہنم درآغوش ہو جاتی ہے' اس کے سمجھنے میں تو کوئی دقت نہیں ہوسکتی۔ اس جہنم کی آگ میں تو ( باقی دنیا کے ساتھ ) ہم خود بھی جھلس رہے ہیں۔ عصر حاضر میں اس لادین سیاست کا امام' میکیاولی قرار دیا جاتا ہے جس کی کتاب (The Prince) دنیا بھر کی قوموں کے نزدیک صحیفۂ آسمانی ہے۔ اس صحفیہ کی تعلیم یہ ہے کہ

> بادشاہ کے لئے صفت روباہی نہایت ضروری ہے تاکہ وہ دجل وفریب کے جال بچھا سکے۔۔ اور اس کے ساتھ خوئے شیری بھی تاکہ وہ بھیڑوں کو خائف رکھ سکے۔ صرف شیر کی قوت کافی نہیں۔ اس لئے عقلمند بادشاہ وہ ہے کہ جب وہ دیکھے کہ کوئی عہد یا معاہدہ اس کے اپنے مفاد کے خلاف جاتا ہے یا جن وجوہات کے پیش نظر وہ معاہدہ کیا گیا تھا وہ باقی نہیں رہیں' تو اسے بلاتأمل توڑ ڈالے۔ لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ اس قسم کی عہد شکنی کے لئے نہایت نگاہ فریب دلائل بہم پہنچائے جائیں۔

آگے چل کر اس میں کہا گیا ہے۔

> جو بادشاہ اپنے پاؤں مستحکم رکھنا چاہتا ہے اس کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ بدی کس طرح کی جاتی ہے اور اس کے لئے کونسا وقت سب سے زیادہ موزوں ہے۔ اس میں خوبیوں کا ہونا ضروری نہیں۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ بظاہر معلوم ہو کہ اس میں خوبیاں موجود ہیں۔ اگر اس میں کوئی خوبی پیدا ہو جاتی ہے تو اس میں چنداں مضائقہ نہیں لیکن یہ ضروری ہے کہ اس کے دل کی حالت ہمیشہ ایسی رہے کہ جونہی وہ دیکھے کہ مصلحت وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اس خوبی کو یکسر الگ کر دیا جائے تو وہ بلاتأمل وتوقف اس کے خلاف عمل کر سکے۔

یہی وہ سیاست ہے جس کے پیش نظر لارڈ گرے نے کہا تھا کہ

> سلطنت کے معاملات' اخلاقی ضابطوں کی رو سے طے نہیں پا سکتے۔

اور والپول نے لکھا تھا کہ

> نیک آدمی کسی سلطنت کو کبھی بچا نہیں سکتے۔ اس لئے کہ سلطنتوں کو بچانے کے لئے جس حد تک چلے جانا بعض اوقات ضروری ہو جاتا ہے' نیک آدمی وہاں تک جا نہیں سکتے۔

اور اٹلی کے مشہور مدبر (Cavour) نے اعتراف کیا تھا کہ

اگر ہم وہی کچھ اپنی ذات کے لئے کریں جو کچھ ہم نے مملکت کے لئے کیا ہے' تو ہم کتنے بڑے شیطان کہلائیں۔

اس قسم کی سیاست' دوسری قوموں کے ساتھ کیا کرتی ہے' اس کا عملی تجربہ ہمیں گذشتہ ۵۸ سال سے ہو رہا ہے ایک کشمیر کے مسئلہ کو لیجئے۔ یہ مسئلہ ایسا نہیں جس کے متعلق بھارت اور پاکستان میں کوئی خفیہ بات چیت ہوئی ہو۔ یہ مسئلہ دنیا کی سب سے بڑی بین الاقوامی عدالت (اقوام متحدہ) میں پیش ہوا اور وہاں طے یہ پایا کہ کشمیر ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہے جس کا حل یہ ہے کہ اہل کشمیر خود اس کا فیصلہ کریں کہ وہ پاکستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا ہندوستان کے ساتھ۔ بھارت کی حکومت نے اس فیصلہ کو تسلیم کر لیا تھا اور اس میں اس کے بعد آج تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس ۵۸ سال کے عرصہ میں پاکستان نے بار بار اس کی کوشش کی کہ بھارت اس فیصلہ کو بروئے کار لانے پر آمادہ ہو جائے لیکن اس نے ایک نہیں سنی۔ یہ مسئلہ بھارت اور پاکستان میں باہمی اختلاف کی اصل و بنیاد ہے۔ اب بھارت کی کیفیت یہ ہے کہ وہ دنیا کے سامنے شور مچاتا ہے کہ ہم اس اختلاف کو ختم کرنے کے لئے ہر وقت آمادہ ہیں لیکن پاکستان اس طرف آتا ہی نہیں اور جب پاکستان کہتا ہے کہ آؤ! اس سوال پر غور کریں تو وہ صاف کہہ دیتا ہے کہ کشمیر تو ہندوستان کا اٹوٹ انگ ہے' اس لئے اس پر کسی قسم کی گفتگو ہو نہیں سکتی۔ کوئی اور بات کہئے ادھر یہ کہتا ہے اور ادھر پھر چلانا شروع کر دیتا ہے کہ دیکھئے! پاکستان' امن اور صلح کے لئے آمادہ ہی نہیں ہوتا۔ وہ یہ کچھ کرتا ہے۔ دھڑلے سے کرتا ہے۔ بلا کسی جھجک اور ندامت کے کرتا ہے اور کئے چلا جاتا ہے۔

یہ رویہ بھارت کا ہے۔ اس کے بعد دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں کے ''امن وسلامتی'' کے پیامبر اور مصالحت و خیر سگالی کے دعویدار آتے ہیں۔ پاکستان سے کہہ دیتے ہیں کہ تمہارا موقف بالکل درست ہے۔ تم حق بجانب ہو۔ اور یہی کچھ بھارت سے کہہ دیتے ہیں اور مشترکہ اعلامیہ میں دونوں کو نہایت ناصحانہ انداز سے مشورہ دیتے ہیں کہ تمہیں چاہئے کہ اپنے اختلافی معاملات کا تصفیہ' باہمی گفت وشنید سے پرامن طریقہ سے کر لو۔ اختلاف اور جنگ بہت بری چیزیں ہیں۔ یہ کچھ گذشتہ ۵۸ برس سے ہو رہا ہے۔ نہ ان سلطنتوں کے اندر کوئی خدا کا بندہ ایسا ہے جو بھارت سے کہے کہ تمہیں اپنے معاہدہ کو اس طرح توڑتے ہوئے شرم آنی چاہئے' نہ اقوام متحدہ خود آگے بڑھ کر اپنے فیصلے کو بروئے کار لانے کے لئے کچھ کرتی ہے۔ یہ کچھ ۵۸ برس سے ہو رہا ہے اور اہل کشمیر' بھارت کے استبداد کی چکی میں پستے چلے جا رہے

ہیں اور اب تو ان بچاروں کی حالت نزع تک پہنچ چکی ہے۔ ۱۹۶۵ء میں بھارت نے' اپنے حمایتیوں کی شہ پر یہ چاہا کہ اس تنازعہ کو تلوار کے زور سے ختم کر دیا جائے لیکن اہل پاکستان کے جذبۂ حق وصداقت اور یقین محکم نے ایسا کرشمہ دکھایا کہ بھارت کی تلوار خود اس کے قلب میں پیوست ہوگئی۔ اسے میدان جنگ سے بھاگتا دیکھ کر' اس کے حمایتی پھر امن کے علمبردار بن کر' بیچ بچاؤ کرنے کے لئے آ دھمکے۔ پھر فراموش کردہ وعدوں کی تجدید ہوئی۔ جب شکست خوردہ بھارت پھر سے اپنے آپ میں آیا تو اس نے وہی پرانے حیلے برتنے شروع کر دیئے اور ان صلح کرانے والوں میں سے بھی کوئی اس سے نہیں کہتا کہ تم اپنے وعدوں سے کیوں پھر رہے ہو؟

یہ ہیں اس سیاست کے کرشمے جو دیؔن سے الگ ہو کر ''چنگیزی'' بن جاتی ہے۔ اب آپ نے سمجھا کہ قرآن نے اسے کیوں شرطِ ایمان قرار دیا تھا کہ سیاست ہمیشہ دیؔن کے تابع رہے؟ اس سیاست پر ایمان رکھنے والا جب کسی قوم سے کوئی معاہدہ کرتا ہے تو اس کے سامنے دیؔن کا یہ غیر متبدل حکم ہوتا ہے کہ

و اوفوا بالعھد۔ ان العھد کان مسئولا۔ (۱۷/۳۵)۔

تم اپنے عہد و پیمان کو پورا کرو۔ یاد رکھو! اس کے متعلق تم سے باز پرس ہوگی۔

یہ ہے فرق ایک سیکولر اسٹیٹ اور دینی ریاست میں۔ ہمارے ہاں' جن حضرات کے دل میں رہ رہ کر سیکولر اسٹیٹ کا تصور کروٹیں بدلتا ہے' ہم ان سے پوچھنا چاہتے ہیں کہ آپ ذرا سینے پر ہاتھ رکھ کر کہئے کہ جن دو نظاموں کا تقابلی نقشہ آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے' آپ ان میں سے کس نظام کے تابع زندگی بسر کرنا پسند کریں گے؟ سیکولر اسٹیٹ کے تابع یا قرآن کی رو سے متشکل کردہ دینی ریاست کے اندر۔

لیکن یہ حضرات بھی سچے ہیں۔ ان کے سامنے دینی ریاست کا جو نقشہ پیش کیا جاتا ہے' اس کا ''اصول'' یہ ہے کہ:

> زندگی کی بعض ضروریات ایسی ہوتی ہیں جن کے لئے جھوٹ بولنا نہ صرف جائز بلکہ شرعاً واجب ہو جاتا ہے۔ (سید ابوالاعلیٰ مودودی)۔

وہ کہتے ہیں کہ اس دینی ریاست سے تو سیکولر اسٹیٹ ہزار درجہ اچھی ہوتی ہے۔ اس میں کم از کم جھوٹ کو ''آسمانی سند'' تو حاصل نہیں ہوتی۔

یہ ہیں وہ لوگ جو اسلام کے راستے میں ہمیشہ حائل رہے ہیں اور آج بھی اسلام کا نام لے کر' لوگوں کو اسلام

کے قریب آنے سے روکتے ہیں۔لیکن اب ان کا چراغ زیادہ عرصہ تک جل نہیں سکتا۔ دنیا سیکولر نظام سے بھی تنگ آ چکی ہے اور خدا کے نام کو (Exploit) کرنے والے مذہبی مفاد پرستوں سے بھی۔ اسے بالآخر دینؔ کی طرف آنا ہوگا اور ایسا ہو کر رہے گا۔ یہ وہ نظام ہوگا جس کی خصوصیت یہ ہوگی کہ لا تملک نفس لنفس شیأ۔ و الامر یومئذ للہ (۸۲/۱۹)۔ اس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کو اپنا دبیل اور آلۂ کار نہیں بنا سکے گا اور تمام امور کے فیصلے مستقل اقدار خداوندی کے مطابق ہوں گے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

غلام احمد پرویزؒ

# اسلام میں ''فکر'' کی گنجائش

[پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ پولٹیکل سائنس کی دعوت پر' پرویز صاحب نے' ۲۵/نومبر ۱۹۶۷ء کی صبح' نیوکیمپس میں' اس شعبہ کے ایم۔اے (فائنل) کے طلباء و طالبات سے' مندرجہ بالا موضوع پر خطاب فرمایا تھا۔ خطاب برجستہ تھا جسے' بعد میں ''نوٹس'' سے قلمبند کرلیا گیا تھا اور اب مکرر نذرِ قارئین ہے۔

(طلوع اسلام)]

محترم پروفیسر صاحب۔ عزیز طلبائے علم و طالبات۔ سلام ورحمت۔

میں بالعموم تقاریر و تقاریب کے سلسلہ میں کہیں جایا نہیں کرتا۔ اس کے لئے میرے پاس وقت نہیں ہوتا۔ لیکن جب آپ کے نمائندگان نے موجودہ اجتماع کے سلسلہ میں مجھ سے خطاب کے لئے کہا تو میں نے بلا توقف اظہارِ رضامندی کر دیا۔ یہ اس لئے کہ مجھے اس حقیقت کا اچھی طرح اندازہ اور احساس ہے کہ قوموں کی تشکیل و تعمیر میں نوجوان طالب علموں کا کس قدر ہاتھ ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ قوموں کا مستقبل ہوتا ہی ان کی ابھرنے والی نسلوں کے ہاتھ میں ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ جس قسم کے آج نوجوان طالب علم' اسی قسم کی کل کی قوم۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے ہمیشہ اپنے پیغام کا اولین مخاطب اسی طبقہ کو قرار دیا ہے اور علامہ اقبالؒ کی ہمنوائی میں' میری بھی یہی آرزو ہوتی ہے کہ ؎

جوانوں کو مری آہِ سحر دے
پھر ان شاہیں بچوں کو بال و پر دے
خدایا! آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

عزیزانِ من! اس خطاب کے دعوت نامہ میں تجویز یہ کیا گیا تھا کہ متقدمین میں سے کسی مسلم مفکر (Muslim Thinker) پر تنقید و تبصرہ کو موضوع خطاب

رکھا جائے۔لیکن میں نے اس سے اختلاف کی جرأت کی' جس کی وجہ بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ پاکستان ایک آئیڈیالوجیکل اسٹیٹ (نظریاتی مملکت) ہے اور اس کی درس گاہوں میں (بالعموم) مسلم طلباء تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ بنابریں میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ہمارے مسلم طلباء جو مضمون بھی پڑھیں' انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اسلام کا اس مضمون سے کیا تعلق ہے اور اسے اس کے نظریاتی نقشہ میں کیا مقام حاصل ہے۔ آپ نے کسی ''مسلم مفکر'' پر محاکمہ کو موضوع خطاب تجویز کیا۔لیکن میرے نزدیک' سب سے پہلے دیکھنے اور سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اسلام میں ''فکر'' (Reason یا Thought) کی گنجائش بھی ہے یا نہیں؟ اس لئے کہ ہمیں بتایا یہ جاتا ہے کہ ''مذہب'' کی بنیاد ایمانیات پر ہوتی ہے اور ایمان (Faith) اور فکر (Reason) دو متضاد چیزیں ہیں۔ ایمان' کسی بات کو بلاسوچے سمجھے مان لینے کو کہتے ہیں۔ لہٰذا اگر بات فی الواقعہ یہی ہے' تو پھر ''مسلم مفکر'' کی تو اصطلاح ہی جمع بین النقیضین ہے۔ یہ دو الفاظ (Self - Contgradictory) ہیں۔ اگر وہ مسلم ہے تو مفکر نہیں ہوسکتا اور اگر وہ مفکر ہے تو مسلم نہیں ہوسکتا۔لیکن اگر یہ نظریہ صحیح نہیں' یعنی اسلام اور فکر باہمدگر متضاد حقیقتیں نہیں' تو پھر اگلا سوال یہ سامنے آئے گا کہ کیا اسلام میں فکر کا میدان لامحدود ہے یا اس کی کچھ حدود مقرر ہیں۔ اگر اس کی جولانگاہ لامحدود ہے' تو پھر ایک (Secular Thinker) اور (Muslim Thinker) میں کوئی فرق نہیں ہوسکتا اور اگر اس کے لئے کچھ حدود و قیود ہیں تو وہ کیا ہیں اور انہیں کس نے متعین کیا ہے۔

یہ ہیں' عزیزان من! وہ وجوہات جن کی بنا پر میں نے مناسب سمجھا کہ سب سے پہلے اس موضوع کو لیا جائے کہ اسلام میں فکر کی گنجائش ہے یا نہیں۔ اور اگر ہے تو کس حد تک۔ مجھے امید ہے کہ میری اس وضاحت کے بعد آپ مجھ سے متفق ہوں گے کہ یہ بنیادی موضوع زیادہ موزوں ہے۔ اس تمہید کے بعد آپ اصل موضوع کی طرف آیئے۔

☆☆☆

''مذہب'' کے متعلق یہ سمجھنا بالکل صحیح ہے کہ اس میں چند عقائد کو بلاسوچے سمجھے' آنکھیں بند کر کے مان لینا ہوتا ہے۔ اس میں عقل و فکر' غور و تدبر' دلیل و برہان کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب اور سائنس میں مستقل نزاع' اور (Faith) اور (Reason) میں مسلسل جنگ چلی آ رہی ہے۔لیکن اسلام' میرے عزیزو! مذہب ہے ہی نہیں۔ یہ دین ہے۔ دین' قانون (Law) کو کہتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ قانون کی بنیاد ہی علم و بصیرت اور دلیل و برہان پر ہوتی ہے۔ سنئے' کہ اس باب میں قرآن کریم کیا کہتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ

لا تقف ماليس لک بہٖ علم۔

جس بات کا تمہیں علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگا کرو۔

یہاں سے یہ سوال پیدا ہوگا کہ علم کہتے کسے ہیں؟ قرآن اس سوال کا جواب ہماری قیاس آرائیوں پر نہیں چھوڑتا۔ خود ہی جواب بھی دیتا ہے کہ بات ہر قسم کے شک وشبہ سے بالا ہو جائے۔ وہ کہتا ہے کہ یاد رکھو۔

ان السمع و البصر و الفؤاد کل اولٰئک کان عنہ مسئولا۔ (۱۷/۳۶)۔

تمہاری سماعت، بصارت، اور قلب سے اس کے متعلق پوچھا جائے گا (کہ انہوں نے اس بات کے صحیح ہونے کی شہادت دی تھی؟)

یہ آیت، علم کی دنیا میں ایک عظیم حقیقت کی آئینہ دار ہے۔ انسانی حواس (Senses) باہر کی دنیا کے متعلق، کچھ اطلاعات بہم پہنچاتے ہیں۔ اسے (Sense-Data) یا مدرکات (Perceptual Knowledge) کہتے ہیں۔ یہ اطلاعات، انسانی قلب (Mind) کے سامنے جاتی ہیں تو وہ اس سے ایک نتیجہ اخذ کرتا ہے اور اس قسم کے نتائج سے تصورات قائم کئے جاتے ہیں۔ اسے (Conceptual Knowledge) کہتے ہیں۔ لہٰذا، قرآن کریم نے اس ایک مختصر سی آیت میں علم کی اہمیت اور اس کی تعریف (Definition) اور تشریح نہایت جامع انداز میں بیان کر دی اور لوگوں سے کہا کہ جس بات کا تمہیں اس طرح علم نہ ہو اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ دوسرے مقام پر وہ اسی کی وضاحت میں کہتا ہے کہ جو لوگ اس طرح اپنے حواس اور علم و بصیرت سے کام نہیں لیتے، وہ جہنمی ہیں۔ آیت یہ ہے۔

و لقد ذرانا لجھنم کثیرا من الجن و الانس۔ لھم قلوب لا یفقھون بھا۔ و لھم اعین لا یبصرون بھا۔ ولھم اٰذان لا یسمعون بھا۔ اولٰئک کالا نعام بل ھم اضل۔ (۷/۱۷۹)۔

مطلب اس کا یہ ہے کہ وہ لوگ جن کی کیفیت یہ ہے کہ ان کی آنکھیں ہیں لیکن ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے، کان ہیں لیکن ان سے سننے کا کام نہیں لیتے، سینے میں دل بھی رکھتے ہیں لیکن اس سے سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے، یہ اہل جہنم ہیں۔ ان کی محض شکل وصورت انسانوں جیسی ہے۔ ورنہ وہ انسان نہیں، حیوان ہیں، بلکہ ان سے بھی گئے گذرے۔

آپ نے غور کیا کہ سماعت و بصارت اور قلب سلیم سے کام نہ لینے والوں کے متعلق قرآن کا فیصلہ کیا ہے؟ اس آیت میں اس نے انہیں حیوان کہا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔۔۔

ان شر الدواب عند اللہ الصم البکم الذین لا یعقلون۔ (۸/۲۲)۔

خدا کے نزدیک' ساری مخلوق میں سے بدترین وہ لوگ ہیں جو عقل وفکر سے کام نہیں لیتے۔

ایک جگہ وہ کہتا ہے کہ۔

جب اہل جہنم' جہنم میں پہنچیں گے' تو وہاں کے محافظ ان سے پوچھیں گے کہ تم نے بالآخر وہ کونسا جرم کیا تھا جس کی وجہ سے تم یہاں آ گئے؟

سوال آپ نے سن لیا۔ اب ان کا جواب سنئے:

وقالوا۔ لو کنا نسمع او نعقل ما کنا فی اصحٰب السعیر۔ (۱۰/۶۷)۔

وہ کہیں گے' جو کچھ ہم سے کہا جاتا تھا' اگر ہم اسے غور سے سنتے اور عقل وفکر سے کام لیتے تو ہمارا شمار کبھی اہل جہنم میں نہ ہوتا۔

''ہمارا جرم یہی ہے کہ ہم نے غور وتدبر اور عقل وفکر سے کام نہ لیا''۔ اسی قسم کے لوگوں کے متعلق' (نبی اکرم ﷺ سے کہا گیا کہ۔۔

افانت تسمع الصم و لو کانوا لا یعقلون۔

کیا تو ایسے بہروں کو سنا سکے گا' جو عقل سے کام نہیں لیتے؟۔۔

افانت تھدی العمی ولو کانوا لا یبصرون۔۔ (۴۳۔۴۲/۱۰)۔

کیا تو ایسے اندھوں کو راستہ دکھا سکے گا جو آنکھیں کھول کر دیکھنا ہی نہیں چاہتے؟

یہ اس لئے کہ حضور ﷺ کی دعوت علیٰ وجہ البصیرت تھی اور جو دعوت عقل وبصیرت پر مبنی ہو اس سے استفادہ وہی کر سکتا ہے جو عقل وبصیرت سے کام لے۔ چنانچہ قرآن کریم میں ہے کہ حضور ﷺ سے کہا گیا کہ ان سے کہہ دو کہ ھٰذہ سبیلی۔ یہ ہے میرا راستہ۔۔ادعوا الی اللہ علیٰ بصیرۃ انا ومن اتبعنی۔ (۱۲/۱۰۸)۔ میں جو تمہیں خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں تو یہ دعوت علم وبصیرت پر مبنی ہوتی ہے۔ میرا بھی یہی طریق ہے' اور جو لوگ میرا اتباع کریں گے ان کا طریق بھی یہی ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ جو لوگ اس دعوت کی مخالفت کرتے تھے' ان سے کہا جاتا تھا کہ میں تم سے کوئی بات دھاندلی سے نہیں منوانا چاہتا' دلیل و برہان کی رو سے منوانا چاہتا ہوں۔ تم اگر اسے صحیح نہیں سمجھتے تو ھاتوا برھانکم ان کنتم صٰدقین۔ (۲/۱۱۱)۔ تم بھی اس کے مقابل میں دلیل و برہان لاؤ۔ کذب و صداقت (جھوٹ اور سچ) کا فیصلہ دلیل و برہان سے ہوتا ہے۔ یہ نہ اندھی عقیدت سے ہوتا ہے نہ دھاندلی سے۔

عزیزان من! جو کچھ میں نے اس وقت تک کہا

ہے اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اسلام کے ہر دعویٰ کی بنیاد عقل وفکر پر ہے۔ قلت وقت مانع ہے ورنہ میں قرآن کریم سے اسی نہج کی اور متعدد آیات پیش کرتا۔ لیکن آخر میں صرف ایک آیت پر اکتفا کروں گا اور آپ دیکھیں گے کہ وہ آیت ایسی قول فیصل اور (یوں سمجھئے کہ) حرفِ آخر ہے کہ اس کے بعد اس سلسلہ میں کچھ اور کہنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔

حضورﷺ نے ان لوگوں کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کرنے میں ایک عمر گذار دی۔ اس نظام زندگی کی تفصیلات بڑی شرح و بسط سے بیان فرمائیں۔ ایک ایک گوشے کی جزئیات تک کو سامنے لائے۔ لیکن آخر میں آپﷺ نے ان سے کہا کہ دیکھو بھئی! انما اعظکم بواحدۃ۔۔

میں تم سے صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔

صرف ایک بات' آپ سوچئے عزیزم! کہ وہ بات کس قدر جامع' بنیادی اور اہم ہوگی جس میں حضورﷺ کا سارا پیغام سمٹ کر سامنے آجانا تھا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ۔۔

ان تقوموا للہ مثنیٰ و فرادیٰ۔۔

وہ بات بڑی توجہ سے سننے کی ہے۔ اس کے لئے تم (سب کے سب نہیں تو کم از کم) ایک ایک' دو دو' کر کے کھڑے ہو جاؤ۔ خدا کے لئے کھڑے ہو جاؤ۔ اور اس کے بعد حضورﷺ نے وہ ایک بات کہی۔ وہ بات صرف ایک لفظ میں کہہ دی گئی۔ آپ نے فرمایا۔ ثم

تتفکروا

تم سوچا کرو۔ غور وفکر کیا کرو!

میں سمجھتا ہوں کہ اس کے بعد اس سلسلہ میں' مجھے بھی کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں!

یہ ہے عزیزان من! اسلام میں فکر کا مقام!

☆☆☆

اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس فکر کا میدان غیر محدود ہے یا کسی خاص حدود کے اندر رہتے ہوئے ہی فکر کی گنجائش ہے؟ تفصیل اس جواب کی طول طویل ہے لیکن میں مختصر الفاظ میں اتنا کہہ دینا کافی سمجھتا ہوں کہ اس کے لئے ویسے ہی کچھ حدود مقرر ہیں جیسے ایک سائنسدان کے لئے فکری حدود متعین ہوتی ہیں۔ ایک سائنٹسٹ کے سامنے' فطرت کے قوانین ہوتے ہیں جو غیر متبدل ہیں۔ وہ ان قوانین کی حدود کے اندر رہتے ہوئے ہی اپنی فکر میں آزاد ہوتا ہے۔ اگر وہ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے فکر سے کام نہیں لیتا تو اسے بھی سائنٹسٹ نہیں کہہ سکتے اور اگر وہ ان قوانین سے اعراض برتتا ہے یا تجاوز کرتا ہے' تو بھی وہ سائنٹسٹ نہیں کہلا سکتا۔ فطرت کے یہ قوانین خارجی دنیا سے متعلق ہوتے ہیں۔ لیکن انسانی دنیا کے لئے بھی کچھ قوانین ہیں' انہیں کلمات اللہ یا

مستقل اقدار (Permanent Values) کہا جاتا ہے۔ قوانین فطرت کی طرح یہ قوانین بھی غیر متبدل ہوتے ہیں۔ اس حقیقت کو بھی اسی مقام پر سمجھ لیجئے کہ فطرت کے قوانین سائنسدان (یا کسی اور انسان کے) بنائے ہوئے نہیں ہوتے' وہ خدا کے متعین کردہ ہوتے ہیں۔ سائنٹسٹ ان قوانین کو وضع نہیں کرتا' بلکہ صرف (Discover) کرتا ہے۔ وہ کتاب فطرت کو لکھتا نہیں' اسے پڑھتا ہے۔ اسی طرح یہ مستقل اقدار بھی انسانوں کی وضع کردہ نہیں ہوتیں۔ خدا کی متعین کردہ ہوتی ہیں۔ سائنٹسٹ ان قوانین کو اپنے تجربات (Trial and Error) کے ذریعے دریافت کرتا ہے۔ لیکن انسانی زندگی سے متعلق مستقل اقدار' کا علم وحی کی رو سے دیا جاتا ہے۔ (وحی کا موضوع الگ ہے اور اس کی تفصیل میں جانے کا یہ مقام نہیں۔ اس وقت آپ کے لئے اتنا سمجھ لینا ہی کافی ہوگا کہ قوانین فطرت کی طرح مستقل اقدار بھی خدا کی متعین کردہ اور غیر متبدل ہوتی ہیں۔ یہ اقدار' اپنی مکمل شکل میں' قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں۔ چنانچہ ارشاد خداوندی ہے۔

تمت کلمت ربک صدقا و عدلا۔
لا مبدل لکلمٰته۔ (۶/۱۱۶)۔

تیرے رب کے یہ قوانین جو صدق و عدل پر مبنی ہیں' ہر اعتبار سے مکمل ہو گئے ان میں کوئی رد و بدل نہیں ہوسکتا۔

اس مقام پر آپ کے دل میں یہ سوال پیدا ہوگا کہ ان (مستقل اقدار) کو کس طرح مانا جائے گا؟ اور اس کا جواب یہ ہے کہ اسی طرح' جیسے قوانین فطرت کو مانا جاتا ہے۔ انہیں علم و بصیرت' غور و فکر اور دلائل و برہان کی رو سے مانا جائے گا اور جب ان پر عمل کیا جائے گا تو ان کے نتائج' ان کی صداقت کی شہادت بنتے جائیں گے اس پر شاید آپ یہ کہیں کہ پھر ''ایمان'' کا مقام کونسا ہے؟ اس سلسلہ میں میری مشکل پھر وہی ہے کہ یہ موضوعات بڑے تفصیل طلب ہیں اور آپ نے اس خطاب کے لئے وقت بہت کم رکھا ہے۔ اس وقت میں صرف اتنا کہہ سکتا ہوں کہ ''ایمان'' کا ترجمہ (Faith) نہیں (Conviction) ہے۔ ہماری سب سے بڑی دشواری یہی ہے کہ اسلام (جو ایک دین ہے) کی اصطلاحات کا ترجمہ ''مذہب'' کے الفاظ میں کر دیا گیا ہے یہی وہ بنیادی غلطی ہے جس کی وجہ سے اسلام کا صحیح تصور ہمارے سامنے آنے ہی نہیں پاتا اور ہمارا ذہن طرح طرح کے شکوک و شبہات کی آماجگاہ بنا رہتا ہے۔ ایمان (Conviction) کا دوسرا نام ہے اور یہ ظاہر ہے کہ (Conviction) پیدا ہی پورے پورے غور و فکر سے ہوتی ہے اور اس کا نتیجہ ذہن اور قلب کا کامل اطمینان ہوتا ہے۔ جسے اس طرح پورے غور و خوض کے بعد' علم و بصیرت کی بنا پر اس حقیقت پر یقین آجاتا ہے' اسے مومن کہتے ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم نے

مومنین کی بنیادی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ۔

الذین اذا ذکروا بایات ربھم لم یخروا علیھا صما و عمیانا۔ (۲۵/۷۳)۔

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب ان کے سامنے آیات خداوندی پیش کی جاتی ہیں تو یہ ان پر بھی بہرے اور اندھے بن کر نہیں گر پڑتے۔ ان پر آنکھیں کھول کر ایمان لاتے ہیں۔

ان تصریحات سے عزیزان من! یہ حقیقت آپ کے سامنے آ گئی ہوگی کہ ''مسلم مفکر'' اسے کہیں گے جو ان مستقل اقدار کی حدود کے اندر رہتے ہوئے' مسائل حیات پر غور و فکر کرے۔ یہی ہمارے لئے اس بات کے پرکھنے کا معیار ہوگا کہ فلاں مفکر کی فکر کس حد تک اسلامی ہے۔ یہ حدود ہمیشہ غیر متبدل رہیں گی لیکن ان کے دائرے کے اندر کی گئی فکر' قابل تغیر و تبدل ہوگی۔ ثبات و تغیر کے اسی امتزاج کا نام اسلامی فکر ہے علامہ اقبالؒ نے اس عظیم حقیقت کو اپنے خطبات میں ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیات کلی کی روحانی اساس ازلی و ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیر و تنوع کے پیکروں میں ہوتی ہے۔ جو معاشرہ حقیقت مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل اور تغیر پذیر عناصر میں تطابق پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل' اور ابدی اصول ہوں اس لئے کہ اس' ہر آن بدلنے والی' دنیا میں ابدی اصول ہی وہ ٹھوس بنیاد ہیں جس پر ہم اپنے پاؤں ٹکا سکتے ہیں۔ لیکن اگر ان ابدی اصولوں کے متعلق یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے میں تغیر کا امکان ہی نہیں..... تو اس سے زندگی جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے' یکسر جامد بن کر رہ جائے گی۔ سیاسی اور معاشرتی دنیا میں یورپ کی ناکامی' اول الذکر اصول کی صداقت کی شہادت ہے اور اسلام جس طرح گذشتہ پانچ صدیوں میں منجمد بن کر رہ گیا ہے' ثانی الذکر اصول کی شہادت۔

یہی وہ حقیقت ہے جسے انہوں نے دوسرے مقام پر ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ؎

یہاں مرض کا سبب ہے غلامی و تقلید
وہاں مرض کا سبب ہے نظامِ جمہوری
نہ مشرق اس سے بَری ہے نہ مغرب اس سے بَری
جہاں میں عام ہے قلب و نظر کی رنجوری!

ثبات نہ ہو تو قوموں کی حرکت' سفر نہیں' آوارگی بن کر رہ

جاتی ہے۔ اور اگر تغیر نہ ہو تو انسان' ممی شدہ لاش سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔ یہ' تعینِ منزل کے بعد حرکت ہی ہے جس سے قوموں کی تقدیریں صبح وشام بدلتی رہتی ہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے حضور نبی اکرم ﷺ نے ان بصیرت افروز الفاظ میں جلوہ بار فرمایا ہے کہ۔

من استویٰ یو ماہ فھو مغبون۔

جس کے دو دن ایک جیسے گذر گئے (یعنی آج جس کا قدم گذشتہ کل کے مقابلہ میں آگے نہ بڑھا) وہ سخت نقصان میں رہا۔ عزیزان من! اللہ تمہیں اس کی توفیق عطا کرے کہ تم قوم کا امروز (آج) دوش (گذشتہ کل) سے روشن تر کر دو کہ تم میں سے۔

ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

والسلام۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

منصور سرمدی

# روایت اور جدیدت کی کشمکش

جوں جوں امت مسلمہ کا اجتماعی شعور بیدار ہوتا جا رہا ہے' ہماری مذہبی پیشوائیت کے آہنی شکنجوں کی گرفت کمزور پڑتی جا رہی ہے' اس کے تار و پود بکھرتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب کسی ایسے شخص کے بارے میں جس سے مذہبی پیشوائیت کو اختلاف ہوتا تھا' بارگاہ پیشوائیت سے کفر کا فتویٰ صادر کر دیا جاتا تھا تو اس کی زندگی اجیرن ہو جاتی تھی' اس کا گھر سے نکلنا محال ہو جاتا اور اس کی بیوی اس پر حرام سمجھی جاتی تھی۔ یہ سب کچھ عوامی دباؤ کے زور پر کیا جاتا تھا۔ اس بات کو کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا جب ایک عیسائی پادری کی کتاب ''امہات المومنین'' کے جواب میں ڈپٹی نذیر احمد دہلوی نے ''امہات الامہ'' تحریر کی تو ہماری مذہبی پیشوائیت اسے برداشت نہ کر سکی۔ چونکہ کتاب میں پیش کئے گئے مؤقف سے انہیں اختلاف تھا' بس پھر کیا تھا' ایک طوفان اٹھا دیا گیا۔ اس طوفان کی روداد ڈپٹی صاحب کے ایک ہمعصر' قاری عباس حسین کی زبانی سنئے' لکھتے ہیں:

''غالباً ۱۹۱۱ء کے جاڑوں کا ذکر ہے کہ اجمیری دروازے کے باہر عربک سکول دہلی کے کھیل کے میدان میں ندوۃ العلماء کا جلسہ ہوا۔ تمام ہندوستان سے بڑے بڑے مولوی آئے۔ عربک سکول کے بورڈنگ ہاؤس میں مہمانوں کے ٹھہرنے کا انتظام تھا۔ عربک سکول کے بہت سے طالب علم ان مہمانوں کی خاطر مدارات اور جلسہ کے انتظام کے لئے والنٹیر بنے تھے۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ اس جلسہ کی بہت سی خصوصیات تھیں لیکن۔۔۔ سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ مولوی نذیر احمد پر نہایت شدید لعن طعن ہوئے۔ کفر کا فتویٰ لگایا گیا اور ان کی تازہ ترین تصنیف ''امہات الامہ'' نذر آتش کی گئی۔ اس جلسہ میں مولوی صاحبان نے درشت کلامی کا جو مظاہرہ کیا وہ حد درجہ نامناسب تھا۔ ایک ایک مولوی اٹھتا تھا اور انتہائی درشت آواز

میں سخت الفاظ کہتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ مولوی نذیر احمد پر سب وشتم کر کے وہ اسلام کی کوئی بڑی خدمت انجام دے رہا ہے۔ مقررین جوش میں آپے سے باہر ہو جاتے تھے اور ایسے جملے استعمال کرتے تھے جو کوئی پڑھا لکھا آدمی تو کیا' جاہل عوام آپس کی لڑائی جھگڑے میں بھی استعمال نہ کرتے تھے۔ علماء کا یہ جلسہ تھا جس نے علماء کرام کے اس احترام کو جو میری گھٹی میں پڑا ہوا تھا' بہت کچھ متزلزل کر دیا۔ جلسہ میں جو جوش تھا اور ڈپٹی صاحب کے خلاف جو آگ لگائی گئی تھی اور اسے جس طرح ہوا دی جا رہی تھی' اگر اس کو فرو کرنے کی کوشش نہ کی جاتی تو اس کا قوی اندیشہ تھا کہ کوئی سر پھرا جاہل ڈپٹی صاحب کو قتل کر دیتا لیکن یقیناً یہ حکیم اجمل صاحب کا بہت بڑا کارنامہ تھا کہ انہوں نے ڈپٹی صاحب کو اس پر آمادہ کیا کہ تمام کتابیں انہیں دے دیں۔ چنانچہ جلسہ کے دوران ہی پنڈال کے سامنے ''امہات الامہ'' کا ڈھیر لگایا گیا اور علماء نے اس میں آگ لگائی.....ایک ایسی کتاب کے جلنے پر علماء خوش ہو رہے تھے جو ایک پادری کے اسلام پر اعتراضات کے جواب میں لکھی گئی تھی۔''

(نقوش۔شخصیات نمبر۔جنوری ۱۹۵۵ء۔صفحہ نمبر ۵۶۵)۔

یہ تقریباً ایک سو سال پہلے کی بات تھی۔ اس ایک سو سال کے عرصے میں باصلاحیت قومیں کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہیں' سبھی جانتے ہیں۔ چاند تسخیر کر لیا گیا' ستاروں پہ کمندیں ڈال دی گئیں' نا قابل علاج سمجھی جانے والی بیماریوں کے علاج دریافت کر لئے گئے۔ زمین پر' سمندر میں حتیٰ کہ فضا کی پہنائیوں میں انسان نے اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے ہیں لیکن یہ مذہبی پیشوائیت جہاں آج سے سو سال پہلے تھی' آج بھی وہیں کھڑی ہے' گویا۔

زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد

مگر آج ہمارے گرد و پیش حالات نئی کروٹ لے رہے ہیں۔ جیسے جیسے مسلمانوں میں تعلیم عام ہوتی جا رہی ہے' امت کے اجتماعی شعور میں پختگی کے آثار دکھائی دے رہے ہیں اور ان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ ردعمل کے طور پر ہماری مذہبی پیشوائیت اپنے وعظوں میں' اپنے مجلّہ جات میں' اخبارات اور رسائل میں ''جدیدیت''۔ ''روشن خیالی'' اور ''اعتدال پسندی'' جیسی ایجابی اقدار (Positive Values) کے ساتھ ''نام نہاد'' کا سابقہ لگا کر عوام کو آنے والے ''موہوم'' خطرے سے ڈرا رہی ہے۔ حالانکہ پڑھے لکھے لوگوں سے یہ بات مخفی نہیں ہے کہ عرب کے قدامت پسند' تاریک خیال اور انتہا پسند معاشرے میں جس ہستی نے

سب سے پہلے جدیدیت' روشن خیالی اور اعتدال پسندی کی تحریک چلائی وہ کوئی اور نہیں بلکہ حضور خاتم النبین علیہ السلام کی ذات گرامی تھی۔ اپنی بچیوں کو زندہ دفن کر دینے والے قدامت پرست جہلا سے کہا گیا کہ وہ ایسے قبیح فعل سے باز آ جائیں اور اس دین سے ڈریں جب اس قتل کی گئی بچی سے خدا براہ راست دریافت کرے گا کہ

بأی ذنب قتلت۔۔

تمہیں کس جرم میں قتل کیا گیا؟

غلاموں اور لونڈیوں سے غیر انسانی سلوک روا رکھنے والوں سے کہا گیا کہ انہیں بھی اپنے جیسا انسان سمجھو اور حسن سلوک سے پیش آؤ۔ روشن خیال اور اعتدال پسند پیغمبرﷺ نے آئندہ کے لئے غلامی کا دروازہ بند کر دیا۔ غلاموں اور لونڈیوں کا سب سے بڑا ذریعہ جنگ کے قیدی ہوتے تھے' ان کے بارے میں کہا گیا کہ دو میں سے ایک معاملہ کرلو۔

فاما منا بعدو اما فداءً (۴/۴۷)۔

یا تو زرفدیہ لے کر رہا کر دو یا پھر احساناً چھوڑ دو۔

یہ تو چند ایک مثالیں ہیں ورنہ حضورﷺ کی تو پوری دعوت ہی جدیدیت' روشن خیالی اور اعتدال پسندی کے اصولوں پر مبنی تھی۔ زمانہ بت پرستی اور توہم پسندی کی تاریک خیالیوں میں غلطاں و پیچاں تھا' انسانیت کی ناؤ سود خوری' ظلم وستم اور قتل و غارت گری کی انتہا پسندی کے تلاطم خیز طوفان میں بہے چلی جا رہی تھی کہ رسول اللہﷺ نے وحی خداوندی کی مدد سے اس جاہلی معاشرے کو جدیدیت' روشن خیالی اور اعتدال پسندی کی راہ دکھائی۔ آپ کے عہد ہمایوں میں ملت کے مرد و زن بلا تفریق امت کے اجتماعی کاموں میں شریک ہوتے تھے خواہ وہ مساجد میں صلوٰۃ کے اجتماعات ہوں یا غزوات میں میدان جنگ کے محاذ۔

مگر آپ کی رحلت کے کچھ عرصہ بعد جب خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی تو جاہلی زمانے کی انتہا پسندی' تاریک خیالی اور قدامت پرستی کی خصوصیات ایک ایک کر کے واپس آ گئیں۔ ''دین'' اور دنیا میں دوئی (Duality) پیدا کر دی گئی۔ سیاسی قیادت ملوک کے ہاتھ میں اور مذہبی قیادت مذہبی پیشواؤں کے پاس چلی گئی۔ عورت' جسے آپﷺ نے قرآن کی تعلیم کے ذریعے مردوں کے برابر لا کھڑا کیا تھا' مذہبی پیشوائیت نے اسے پھر سے ایک جنس کا سد بنا کے رکھ دیا۔ وہ بیچاری پھر سے لونڈی کے روپ میں نخاس کے بازاروں میں بکنے لگی۔ وضعی روایات کا بازار گرم کیا گیا۔ اس قسم کی روایات بنا بنا کر پھیلا دی گئیں کہ:

۱۔ ''نحوست تین چیزوں میں ہے' عورت' گھر اور گھوڑا۔'' (بخاری)۔

۲۔ ''تین چیزوں کے سوا کوئی چیز نماز نہیں توڑتی'

کتا' گدھا اور عورت''۔ (ترمذی)

اور ستم بالائے ستم یہ کہ ان روایات کو منسوب کر دیا گیا اس ذات اقدس و اعظم ﷺ کی طرف جو اپنے زمانے کے سب سے بڑے روشن خیال و اعتدال پسند' حقوق انسانی کے سب سے بڑے علمبردار اور تکریم بنی آدم کے بہت بڑے داعی تھے۔ جو نحس وسعد کے نظریے اور توہم پرستی کے سب سے بڑے مخالف تھے۔

اس طرح کی روایت سازی کے بل پر مذہبی پیشوائیت نے عوام کو اپنے اقتدار کے آہنی شکنجوں میں جکڑ لیا۔ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت نے ایک دوسرے کو سہارا دیا۔ مسلمان بادشاہوں نے مذہبی پیشوائیت کی مدد کے زیر اثر عورت کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا' یہ روداد جناب علی عباس جلال پوری سے سنئے' لکھتے ہیں:

''آج کل ارباب اصلاح یہ ثابت کرنے کی فکر میں ہیں کہ تمام قدیم اقوام نے عورت کو ذلت کی پستی کے گڑھے میں دھکیل دیا تھا' مسلمانوں نے اسے اس گڑھے سے نکال کر عزت و توقیر کے مقام پر فائز کیا۔ حقیقت یہ ہے اگرچہ بے حد تلخ اور ناگوار ہے کہ جہاں کہیں ہماری حکومتیں قائم ہوئیں اسی ملک میں بردہ فروشی کا کاروبار چمک اٹھا۔ بغداد' سامرا' حلب' قاہرہ' قرطبہ جہاں علوم وفنون اور تہذیب کے مرکز تھے وہاں بردہ فروشی کے لئے بھی رسوائے زمانہ تھے۔ ان کے بازاروں میں کنیزیں بھیڑ بکریوں کی طرح بکتی تھیں۔ گاہک انہیں ٹٹول ٹٹول کر خریدتے جیسے قصاب بھیڑوں کو خریدتا ہے۔ خلفاء اور سلاطین کے محلات میں سینکڑوں کنیزیں موجود تھیں جو اطراف و جوانب کے ملکوں سے درآمد کی جاتی تھیں۔ یہ کنیزیں اپنے آقاؤں کی ہوا و ہوس کی تسکین کا سامان بھی کرتی تھیں اور مجالس ناؤ نوش میں ساقی گری اور ارباب نشاط کے فرائض بھی ادا کرتی تھیں۔ بنو امیہ کے عہد میں مکہ' مدینہ اور طائف میں موسیقی اور رقص سیکھنے کے لئے بڑی بڑی درسگاہیں قائم ہوگئیں جہاں لڑکیاں بطور خراج بغداد بھیجی جاتی تھیں۔ الحمرا میں آج بھی دالان بکر موجود ہے جس میں عیسائی سلاطین کی طرف سے خراج میں بھیجی ہوئی ایک سو کنواری لڑکیاں ہر سال رکھی جاتی تھیں۔ ان حالات کے پیش نظر یہ معلوم کر کے چنداں حیرت نہیں ہوتی کہ ۳۷ خلفائے عباس میں (سے) صرف دو خلیفہ ایسے تھے جو کنیزوں کے بطن سے نہیں تھے۔ یعنی سفاح اور امین الرشید' باقی سب کنیز زادے تھے۔ عرب بردہ فروش بربر اور حبش کے علاقوں پر حملے کر کے ہر سال ہزاروں عورتیں جبراً اٹھا

لاتے تھے اور انہیں مختلف شہروں میں بیچتے تھے۔ ۱۹ ویں صدی تک تمام اسلامی ممالک میں یہ سلسلہ جاری رہا تا آنکہ اہل مغرب نے بردہ فروشی کو خلاف قانون قرار دے کر اس کا خاتمہ کر دیا۔ اب دنیا بھر میں بردہ فروشی کو جرم سمجھا جاتا ہے لیکن نجدی مملکت میں آج بھی مذہب کے نام پر کنیزوں کی فروخت جاری ہے۔ ان حقائق کی موجودگی میں یہ دعویٰ کیسے کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں نے عورت سے بہتر سلوک کیا؟''

(اقبال کا علم کلام۔صفحہ ۲۰۳۔۲۰۲ از علی عباس جلالپوری)۔

ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کے اس کامیاب گٹھ جوڑ نے بالترتیب اپنے سیاسی اور مذہبی مخالفین کو ختم کرنے کے لئے یہ حربہ استعمال کیا کہ جس مخالف کو راستے سے ہٹانا مقصود ہوتا' بارگاہ پیشوائیت سے فتویٰ صادر کر دیا جاتا کہ فلاں شخص اسلام کے دائرے سے خارج ہو کر مرتد ہو چکا ہے لہٰذا واجب القتل ہے۔ چنانچہ بارگاہ ملوکیت اس فتویٰ کو عملی جامہ پہناتے ہوئے اسے تہہ تیغ کر دیتی تھی۔ حال آنکہ رسول خدا ﷺ نے قرآن کا یہ اعلان سب کو سنا دیا تھا کہ۔۔

لا اکراہ فی الدین۔۔

دین میں کوئی زور زبردستی نہیں ہے۔

بہرحال قتل و غارت گری کی اس گرم بازاری کا نتیجہ یہ نکلا کہ امت مسلمہ میں فکر کی شمعیں گل ہوتی اور عقل کے چراغ بجھتے چلے گئے۔ جونہی کسی نے وحیٔ خداوندی یعنی قرآن کریم کی بات کی' مذہبی پیشوائیت اس کے پیچھے لٹھ لے کے پڑ گئی۔ کسی کو معتزلہ کہا گیا' کسی کو قدریہ اور کسی کو نیچری۔۔ اور پھر ان الفاظ کو وہ معنی پہنائے گئے کہ یہ الفاظ کافر' ملحد اور بے دین کے مترادف نظر آنے لگے۔ ان کے خلاف روایات وضع کر لی گئیں۔ مثال کے طور پر' کہا گیا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا۔۔ القدریہ مجوس ھذہ الامۃ یعنی ''قدریہ میری امت کے مجوس ہیں'' اور یوں ان کو مجوسی قرار دے کر قتل کر دیا جاتا حالانکہ ارباب بصیرت سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے مبارک دور میں جبریہ' قدریہ کی بحثوں کا وجود ہی نہیں تھا۔

یوں رجعت الی القرآن (Back To Quran) کا نعرۂ مستانہ بلند کرنے والے اصحاب دانش و بینش کو چن چن کر قتل کر دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پچھلے ایک ہزار سال سے امت مسلمہ مذہبی پیشوائیت کے خونی پنجوں میں جکڑی ہوئی کراہ رہی ہے۔ رجعت الی القرآن کی تحریک ہر دور میں اٹھی اور ملت کے صاحبان عقل و شعور نے اپنی جانوں کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنے خون جگر سے اس کی آبیاری کی۔ ان کے خلاف کیا کیا پراپیگنڈہ نہ کیا گیا' الزامات کے کون کون سے طومار نہ باندھے گئے' مگر مجال

ہے جو ان کے پائے استقلال میں ذرا سی بھی لرزش و لغزش آئی ہو۔ ان جانثاران قرآنی میں واصل بن عطاء اور عمرو بن عبید کا نام ہراول کے طور پر آتا ہے۔ اس کے بعد ابوالہذیل علاف' ابراہیم نظام' ثمامہ بن اشرس' جاحظ' خیاط اور جبائی وغیرہ نے اپنے اپنے انداز میں فکر قرآنی کا پرچم بلند کیا۔ پھر ماضی قریب میں مصر میں محمد عبدہ' رشید رضا' طہ حسین اور احمد امین مصری نے صدائے قرآنی پر لبیک کہا۔ برصغیر میں سرسید احمد خان' مولوی چراغ علی' ڈپٹی نذیر احمد دہلوی' الطاف حسین حالی اور محسن الملک نے رجعت الی القرآن کا نعرۂ مستانہ لگایا۔ ان کے بعد احمد دین امرتسری' اسلم جیراج پوری اور جناب پرویز نے وحی قرآنی کی تعلیم وترویج میں اپنی جانیں کھپا دیں۔ یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ جناب پرویز علیہ الرحمتہ نے اپنی جانفشانی اور استقامت سے رجعت الی القرآن کی تحریک کو بام عروج پر پہنچا دیا۔ ہفتہ واری درس قرآن' ماہنامہ طلوع اسلام' سالانہ قرآنی کنونشنز اور اس کے علاوہ پرویز صاحب کی تین درجن کے قریب تصانیف نے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیا۔ سوچنے سمجھنے والے قلوب واذہان میں انقلاب برپا ہو گیا۔ مذہبی پیشوائیت یہ کب گوارا کر سکتی تھی' چنانچہ فتویٰ بازی کے ذریعے ان کی آواز دبانے کی کوشش کی گئی جو بارآور ثابت نہ ہو سکی۔ پرویز صاحب اپنے پیچھے اپنی مطبوعات اور آڈیو و ویڈیو دروس کی شکل میں ایک بہت بڑا علمی خزانہ چھوڑ گئے۔

جیسا کہ آغاز میں کہا گیا ہے' آج ماحول میں تیزی سے تبدیلی آ رہی ہے۔ ذرائع ابلاغ کی ترقی خصوصاً ٹی وی چینلز اور انٹرنیٹ نے پوری دنیا کو ایک عالمی بستی (Global Village) میں تبدیل کر دیا ہے۔ مختلف تہذیبوں کے میل جول سے خود مسلمانوں میں بیداری کی لہر اٹھ رہی ہے۔ اب کسی طبقہ کے حقوق مذہب کے نام پر مزید غصب نہیں کئے جا سکتے۔ جناب ارشاد احمد حقانی ۶ جولائی ۲۰۰۵ء کی روزنامہ جنگ کی اشاعت میں اپنے کالم ''حرف تمنا'' میں لکھتے ہیں:

> ''ابھی ہندوستان میں ایک مسلمان خاتون عمرانہ علی کی اپنے سسر کے ہاتھوں عصمت دری کا واقعہ رپورٹ ہوا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس پر دیوبند مدرسے کے کسی عالم نے فتویٰ دیا ہے کہ یہ عورت اپنے خاوند کے لئے حرام ہو چکی ہے اور اب اسے اپنے سسر کے ساتھ بیوی بن کر زندگی گزارنا ہوگی۔ اس پر ہندوستان کی مسلم خواتین کی متعدد تنظیموں نے احتجاج کیا ہے اور اس مبینہ فتوے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ تازہ ترین اطلاع اگرچہ یہ ہے کہ شاید ریپ کا یہ واقعہ ہوا ہی نہیں اور دیوبند والوں نے بھی باضابطہ طور پر اس قسم کا کوئی فتویٰ جاری کرنے کا معاملہ مشکوک

بنا دیا ہے۔ لیکن اس سے بہرحال یہ واضح ہوتا ہے کہ پڑھی لکھی مسلمان خواتین اب مولویوں کے فتوے کو من وعن قبول کرنے سے انکاری ہیں۔ واضح رہے کہ یہ مغرب زدہ خواتین نہیں ہیں بلکہ اسلامی اخلاق وآداب کا احترام کرنے والی خواتین اور تنظیمیں ہیں۔''

گزشتہ دنوں ایک سعودی کمپنی نے ایک خاتون کیپٹن حنادی زکریا ہندی کو بطور کمرشل پائیلٹ ملازمت دی تو سعودیہ کے مذہبی حلقوں میں اعتراض کیا گیا کہ یہ تقرر غیر اسلامی ہے۔ امام محمد بن سعود اسلامک یونیورسٹی ریاض کے ایک پروفیسر نے اس تقرری کے خلاف فتویٰ دیتے ہوئے سب سے بڑی دلیل یہ دی ہے کہ کیپٹن حنادی زکریا ہندی کو اپنے فرائض کی ادائیگی کے لئے محرم کے بغیر سفر کرنا پڑے گا۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب ارشاد حقانی صاحب اپنے مذکورہ کالم میں لکھتے ہیں:

''۲۱ویں صدی میں یہ دلیل اپنے اندر جس قدر وزن رکھتی ہے یا نہیں رکھتی ہے اس کا اندازہ مشکل نہ ہونا چاہئے .....ابھی کل کی بات ہے کہ ہماری عدالت عالیہ ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کو کالعدم قرار دے رہی تھی' آج کوئی جج اس رائے کا حامی رہ گیا ہے؟''۔

یہ اور آئے روز اس قسم کے ہونے والے سینکڑوں واقعات اس بات کے غماز ہیں کہ مذہبی پیشوائیت کے آہنی شکنجوں کے بند اب ڈھیلے پڑتے جا رہے ہیں۔ امت کی رگ جاں کو دبوچنے والی اس کی گرفت اب کمزور پڑتی جارہی ہے۔ اپنے ہاتھوں سے نکلتی ہوئی اختیارات کی طاقت اور عوام الناس پر ہزار سالہ اقتدار کی کشتی کو طاقتور قرآنی لہروں میں ہچکولے کھاتے اور ڈوبتے ہوئے دیکھ کر ہماری مذہبی پیشوائیت نے اپنی مخالفانہ مہم تیز کر دی ہے۔ کراچی یونیورسٹی کی طرف سے شائع کردہ مجلّہ ''جریدہ'' نے اپنے شمارہ نمبر۲۹ میں ''عالم اسلام میں جدیدیت اور روایت کی کشمکش'' کے عنوان سے جناب پرویز کو خصوصی تنقید کا نشانہ بنایا ہے اور بے بنیاد الزامات کو بغیر حوالہ دیے ہوئے دہرایا ہے۔ کراچی ہی سے شائع ہونے والے ماہنامہ ''ساحل'' نے اپنی مارچ' اپریل اور مئی کی اشاعتیں اسی موضوع یعنی ''روایت اور جدیدیت کی کشمکش'' کے لئے مخصوص کی ہیں۔ مندرجہ بالا ہر دو رسالہ جات میں پرویز صاحب پر بے بنیاد تنقید کرتے ہوئے ان کا علمی مرتبہ کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس طرح کی الزامی اور مبنی بر کذب و افترئ تحریریں ان لوگوں پر تو اثر انداز ہوسکتی ہیں جنہوں نے پرویز صاحب کا صرف نام سنا ہے اور کتابیں نہیں پڑھی ہیں مگر ہر وہ صاحب بصیرت جس نے براہ راست جناب پرویز کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے' اس کے نزدیک اس قسم کے

پراپیگنڈے کی حیثیت پر کاہ کے برابر بھی نہیں ہے۔ ؎

عرفی تو میندیش زغوغائے رقیباں

آج جب مسلم دنیا بیدار ہو رہی ہے' مذہبی پیشوائیت کو اپنا ہزار سالہ اقتدار خطرے میں نظر آ رہا ہے۔ اس کے فتوے بے اثر ہو رہے ہیں' شہ رگ امت پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑتی جا رہی ہے' اس کا وقار اور دبدبہ مٹی میں ملتا جا رہا ہے' اس کی ''علمی کاوشیں'' اور ''تحقیقی شاہکار'' پوری دنیا میں مسلمانوں کی رسوائی کا سامان مہیا کر رہے ہیں اور اگر قرآنی اصطلاح استعمال کی جائے تو گویا اسے علم کی بارگاہ سے ''آتشیں کوڑے'' پڑ رہے ہیں۔ اس بڑی تبدیلی کی آمد کے خطرہ کو محسوس کر کے مذہبی پیشوائیت کی صفوں میں کھلبلی مچ رہی ہے۔ اس کا دن کا سکون غارت اور راتوں کی نیند برباد ہو رہی ہے اور نتیجتاً ہماری مذہبی پیشوائیت نے شمع آخرِ شب کی مانند تیز لو سے جلنا شروع کر دیا ہے' گویا ؎

کوئی دم کی مہمان ہے اور بجھا چاہتی ہے

مذہبی پیشوائیت کی تنقیدی توپوں کے دہانے ایک مرتبہ پھر خاص طور پر جناب پرویز کی شخصیت کی طرف مڑ گئے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ جب جب مسلم امہ میں روشن خیالی' اعتدال پسندی اور جدیدیت کی آواز بلند ہو گی اور جب جب رجعت الی القرآن کا غلغلہ بلند ہو گا' جناب پرویز کا نام اور کام سرفہرست ہو گا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی

# قرآن کریم کے خلاف فکری بحران کی نشاندہی

مملکتِ پاکستان، برصغیر کے مسلمانوں کی عظیم قربانیوں کے بعد حاصل کی گئی تھی اس کے بنانے کے دوران بھی کئی لاکھ افراد کو جانی قربانی دینی پڑی اور آج بھی ہندوستان کے پندرہ کروڑ مسلمان اس کے عواقب کے شکار ہیں۔ تقسیم ہند سے پیشتر جو بڑے بڑے رؤسا اور تعلقہ دار ہندوستان میں رہ رہے تھے آج ان کی تیسری پشت یا رکشا و ٹیکسی چلاتی ہے یا بہت معمولی معمولی نوکریاں کرتی ہے۔ ہم پاکستان کے مسلمان ان کی Cost پر ان سے بہتر زندگی بسر کر رہے ہیں۔ پاکستان کا قیام بے شک ایک بہت خوش آئند بات ہے لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ آج جبکہ پاکستان کو معرضِ وجود میں آئے ہوئے ۵۷ سال گزر چکے ہیں یہ بات زیر بحث ہے کہ پاکستان کی آئیڈیالوجی کیا ہے اور اس کو کس بنیاد پر حاصل کیا گیا تھا۔ ہماری ٹی۔وی چینلز جو عوام کو (Awareness) آگاہی دے رہی ہیں جن میں بہت عمدہ علمی مذاکرے ہوتے ہیں۔ ان کو دیکھنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ملک کے تعلیم یافتہ طبقے اور دانشوروں میں سخت فکری اختلاف، تضاد اور کنفیوژن ہے اور اس فکری ابتری کی وجہ سے اب تک ہمارا ملک اپنے لئے کوئی سمت مقرر نہیں کر سکا۔ آج کل پاکستان کے مسلمانوں میں چار قسم کے نظریات و خیالات گردش کر رہے ہیں۔

(۱) روایتی مذہبی طبقہ جو علماء کرام کے زیر اثر ہے۔

(۲) خلافت اسلامیہ کا داعی مذہبی طبقہ۔

(۳) دین کو متمکن کرنے والا طبقہ۔

(۴) سیکولر لبرل ذہن رکھنے والے حضرات۔

مجموعی و عمومی طور پر یہ چار فکر ہائے نقطۂ نظر آج کل ہمارے ہاں چل رہے ہیں مگر یہ چاروں اس درجہ قطعی نہیں ہیں کہ دوسروں کو متاثر کر کے اپنا ہم خیال بنا لیں۔ ویسے بھی اتنی بڑی آبادی میں یہ ممکن بھی نہیں کہ سب ہم خیال ہو جائیں۔ بہتر یہی ہے کہ ہر شخص کو اپنا فکر اختیار

کرنے اور اس کو فروغ دینے کا پورا پورا حق ہونا چاہئے۔
اب ان چاروں طبقوں کا مختصر تعارف پیش خدمت عالی کیا جاتا ہے۔

پہلا طبقہ ان عامتہ المسلمین پر مشتمل ہے جو روایتی مذہبی رسومات کی پابندی کرتے ہیں۔ جو نہایت نیک نیتی وخلوص سے مذہبی رسوم ادا کرتے ہیں۔ اسلام کو بطور مذہب کے خیال کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اور بندے کا انفرادی تعلق قائم رکھتے ہیں۔ یہ اسلام یا مذہب کو ایک پرائیویٹ معاملہ شمار کرتے ہیں۔ بنو امیہ و بنو عباس کے دور سے جب خلافت راشدہ کا نظام ختم ہوا' ملوکیت قائم ہوئی' مذہب اور سٹیٹ کو الگ الگ کر دیا گیا۔ حکومت بادشاہوں کے سپرد ہوئی اور مذہبی معاملات علماء کرام کے ذمے ہوئے۔ اسلام بطور ایک کلچر وتہذیب کے باقی رہ گیا۔ اس سے دنیاوی معاملات کا کوئی تعلق نہیں رہا۔ یہ طبقہ صرف نماز' روزہ' زکوٰۃ و دیگر عبادات انجام دینا ہی مذہب کے سارے مطالبات پورے کرنے کے مرادف خیال کرنے لگا۔ نہایت خلوص سے عید میلاد النبی کی تقریبات قائم کرنا' اشک آلود و نیم گریاں آنکھوں سے نعتیں پڑھنا' بائیس رجب کو کونڈے' شب بارات پر آتش بازی چلانا' نذر نیاز تعویذ گنڈے' جنات کو قابو کرنا' مزارات کو غسل دینا۔ ان پر منتیں ماننا' عاشورہ کے دن قبرستان میں فاتحہ پڑھنے کے لئے جانا ضروری خیال کرتا ہے اور اسی طرح دیگر رسومات مذہب کا جزو بن گئیں۔ پیر' مرید' فقیر' علمائے کرام' فقہائے عظام ان ہی کے سہارے زندگی بسر کرتے ہیں۔ مسجدیں بنوانا' ان کی آرائش کرنا' نیکی شمار ہونے لگی۔ بنی امیہ نے جب خلافت کا نظام ختم کیا اور خلافت کو ملوکیت میں تبدیل کر کے' ہر قسم کے ظلم وستم کو روا رکھا۔ رعایا کے تمام حقوق غصب کئے' ذرائع پیداوار پر پورا قبضہ کر کے عوام کو ان کے انتفاع سے محروم کر دیا تو انہوں نے اپنی عاقبت سنوارنے اور عوام میں ہر دل عزیز ہونے کے لئے بڑی بڑی مساجد تعمیر کرنی شروع کر دیں۔ عبدالملک بن مروان کی تعمیر کردہ مسجد آج بھی دمشق میں قابل دید ہے قرآن کریم نے

اجعلتم سقاية الحاج و عمارة المسجد الحرام كمن امن بالله واليوم الاخر وجٰهد فى سبيل الله (۹/۱۹)۔

''کیا تم لوگوں نے حاجیوں کی سقائی اور مسجد الحرام کی آبادی کو اس شخص کے ہمسر بنا دیا ہے جو خدا اور روز آخرت پر ایمان لایا اور خدا کی راہ میں جہاد کیا۔''

اس ہی قسم کے لوگوں کے لئے فرمایا تھا۔ اس نیک نیت' پرخلوص گروہ کے نزدیک اسلام پر عمل کرنے کے لئے الگ حکومت کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے

کہ قیام پاکستان کے دوران ہمارا سارا مذہبی طبقہ' جس کا بیشتر حصہ علماء کرام پر مشتمل تھا وہ پاکستان کے خلاف تھا اور اسلام پر عمل کرنے کے لئے حکومت کو ضروری نہیں سمجھتا تھا۔ جمعیت العلماء ہند' جو علماء کرام کی نمائندہ جماعت تھی' اس نے پاکستان کی ڈٹ کے مخالفت کی تھی۔ اور آخری دور میں جب پاکستان بالکل بننے کے قریب تھا چند علماء بے شک مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے' لیکن ان علماء کرام کے نزدیک بھی اسلامی حکومت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ یہ علماء بھی ان ہی علماء کے گروہ سے الگ ہو کر اس طرف آ گئے تھے ورنہ نظریاتی طور پر یہ بھی ان میں سے ہی تھے۔ ان حضرات کی تحریر کردہ کتب موجود ہیں وہ خود اس بات پر دال ہیں کہ ان کے نزدیک اسلامی حکومت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ یہ وہ مسلمان ہیں جو پیدائشی طور پر مسلمانوں کی قوم سے متعلق ہیں اور ان ہی سے قرآن کریم ایمان لانے کا مطالبہ کرتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے:

یا ایھا الذین امنوا امنوا باللہ و رسولہ و الکتب الذی نزل علی رسولہ و الکتب الذی انزل من قبل (۴/۱۳۶)۔

اے ایمان والو خدا اور اس کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی ہے اور اس کتاب پر جو اس سے پہلے نازل ہوئی ایمان لاؤ۔

نیز ارشاد ہوتا ہے:

یا ایھا الذین امنوا اتقوا اللہ وامنوا برسولہ (۵۷/۲۸)۔

اے ایمان والو' تم اللہ سے تقویٰ اختیار کرو اور ایمان لاؤ اس کے رسول پر۔

یہاں غور فرمائیں کہ قرآن کریم ان کے مسلمان ہونے کے باوجود بھی ان سے ایمان لانے کا مطالبہ کر رہا ہے۔

تاہم اس بات کا اعتراف کرنا ضروری ہے کہ یہ اپنے اعمال میں مخلص طبقہ جو اپنی دانست میں رات دن مذہبی امور کی سرانجام دہی میں منہمک رہتا ہے۔ بہرحال مسلمان ہی شمار ہونا چاہئے کیونکہ جن اعراب نے اسلامی حکومت کے غلبہ کے آگے فرماں پذیری کر کے' خود کو مومن شمار کرنا شروع کر دیا تھا ان کے لئے اگرچہ قرآن کریم نے فرمایا کہ۔

ولما یدخل الایمان فی قلوبکم۔

ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔

لیکن اس کے باوجود وہ امت مسلمہ میں شامل تھے اگرچہ قرآنی نظام حکومت کا عقیدہ ان کا جز وحیات نہیں بنا تھا۔ لیکن قرآن کریم نے ان کو نہ تو امت سے الگ قرار دیا بلکہ انہیں باقی مسلمانوں کی طرح' امت مسلمہ کے افراد ہی قرار دیا تھا۔

اس کے علاوہ ہمارے درمیان جو دوسرا طبقہ ہے وہ خلافت اسلامیہ کا داعی مذہبی طبقہ ہے۔ اس طبقہ میں نہ صرف اسلام سے بھرپور محبت ہے' ان میں زندگی بھی ہے اور یہ اسلام کی خاطر ہر طرح کی قربانی دینے کو بھی تیار ہیں۔ یہ وہ مذہبی طبقہ ہے جو اسلام کی اس تشریح و توضیح میں Beleive کرتا ہے جو بنوامیہ اور بنوعباس کے ادوار میں کی گئی تھی۔ یہ پورے کا پورا لٹریچر جو ہماری تفاسیر' احادیث' فقہ و اصول فقہ پر مشتمل ہے خالص ''مذہبی'' نقطہ نگاہ سے لکھا گیا تھا۔ کیونکہ جب یہ لٹریچر وجود میں آیا تھا اس وقت خلافت کے اسلامی نظام کو منقرض ہوکر دو صدیاں گزر چکی تھیں۔ ملوکیت' پیشوائیت اور جاگیرداری جن کی اسلامی نظام میں قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہے' پوری مضبوطی سے اپنے پاؤں جما چکی تھیں' اس لئے اسلامی نظام کی کوئی رمق اس لٹریچر میں دکھائی نہیں دیتی یہ ایک ہزار سال کا پورے کا پورا لٹریچر ''مذہب'' پر مبنی ہے۔ لیکن دقت اور مصیبت یہ ہے کہ ہمارا یہ طبقہ اس مذہب کو بطور دین کے جاری کرنا چاہتا ہے اور یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں ہوسکتا۔ ہمارے ہاں جس قدر بھی مذہبی جماعتیں خلافت کے قیام کی کوشش کر رہی ہیں' وہ اسی کشمکش میں مبتلا ہیں اور ہمارے ہاں جس قدر کوششیں اسلام کے احیاء کی کی جا رہی ہیں وہ سب ''مذہب'' کے احیاء کی ہو رہی ہیں ''دین'' کے احیاء سے ان کا کوئی علاقہ نہیں ہے۔ ایران کا انقلاب کس درجہ کوششوں کے بعد برپا ہوا' لیکن وہاں بھی یہی غلطی کی گئی کہ انہوں نے اسلامی حکومت کے نقشہ کا سارا دارومدار دین کے بجائے مذہب پر رکھا اور اسی وجہ سے وہ انقلاب کامیاب نہیں ہو سکا۔ مذہب اور دین میں واضح فرق نہ کرنا ہی ہماری بہت بڑی غلطی ہے۔ لیکن اس کی اصل وجہ ہمارے علماء کرام ہیں کیونکہ اول تو وہ دین کے داعی ہی نہیں ہیں' مذہب کے داعی ہیں اور جو جماعتیں خلافت یا دین کی داعی ہوتی ہیں ہمارے علماء کرام ان کے لئے روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ سابقہ ایک ہزار سال کا لٹریچر چھوڑنا نہیں چاہتے اور اسی فقہ پر عمل کرنا چاہتے ہیں جو آج سے کم وبیش ایک ہزار سال پیشتر تحریر کیا گیا تھا۔

ہمارا موجودہ فقہ اسلام کے ابدی و آفاقی اصولوں پر مبنی نہیں ہے بلکہ اس پر عربی و غیرعربی ملوکیتوں کی گہری چھاپ لگی ہوئی ہے۔ دور ملوکیت کے جامد تصورات خاندانی سلطنتوں کے تقاضے پورے کرنے کے لئے معرضِ وجود میں آئے تھے۔ بنوعباس کی حکومت مسلم حکومت یا مسلمانوں کی حکومت ضرور تھی۔ لیکن وہ اسلامی حکومت ہرگز نہیں تھی صرف اسلامی حکومت کے احکام اسلامی فقہ یا اسلامی شریعت ہوتے ہیں۔ یہ قوانین تو ملوکیتی قوانین ہیں ان کو اسلامی فقہ کا نام دینا ہی غلط ہے۔ ویسے بھی فقہ ہمیشہ اجتماعی ہوتا ہے۔ انفرادی نہیں ہوسکتا۔

یہ فقہ انفرادی تھا اس میں اجتماعیت بالکل نہیں تھی۔

سابقہ مذہبی لٹریچر اور فقہ کے اثر کی وجہ سے یہ طبقہ جس فاش غلطی کا مرتکب ہو رہا ہے وہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک اللہ و رسول کی اطاعت کا طریقہ یہ ہے کہ قرآن و حدیث کی اطاعت سے اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ لہٰذا عملی طور پر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں جہاں جہاں رسول کا لفظ آتا ہے' اس کا ترجمہ حدیث قرار پاتا ہے اور اس طرح اللہ و رسول کا عملاً مفہوم قرآن و حدیث ہو جاتا ہے۔ لیکن اس طرح قرآن و حدیث کی اطاعت کے لئے الگ ملک' حکومت یا خلافت اسلامیہ کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ مثلاً ہندوستان' برطانیہ وغیرہ کے مسلمان بھی انفرادی طور پر قرآن و حدیث پر عمل کر سکتے ہیں' یہ ہے وہ تضاد و تناقض جس کا سامنا اس طبقہ کو ہے اور جس سے یہ نہ نکل سکتے ہیں اور نہ نکلنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اس نظریہ سے نکلنے کے لئے حدیث اطاعت کا مرجع باقی نہیں رہتی۔ اور یہ طبقہ کسی حال میں بھی حدیث یا صحیح معنے میں روایات کو چھوڑنے کو تیار نہیں ہے۔ لیکن ان کی ہزاروں خواہشوں اور تمناؤں کے باوجود' اسلامی نظامِ اطاعت کا مرجع حدیث (روایات) قرار نہیں پا سکتی' جس کی تفصیل آگے آتی ہے۔

ہمارے ہاں تیسرا طبقہ وہ ہے جو خالص قرآن کریم کے نظریات کا حامل ہے۔ فلہٰذا دین کے متمکن کرنے کا داعی۔ اس طبقۂ عالیہ کے نزدیک مسلمانوں کا ایک ہزار سال کا سارا لٹریچر قرآن فہمی میں رکاوٹ کا کام دیتا ہے۔ کیونکہ یہ سارا لٹریچر تحریر ہی مذہبی زاویۂ نگاہ سے کیا گیا تھا۔ اس کا دین سے کیا علاقہ۔ اس لئے جو لوگ بھی دین کے داعی بن کے اٹھیں ان کے پیش نظر ایک تو مذہب اور دین کا تصور بالکل واضح' بین اور صاف ہونا چاہئے دوسرے ان کے سامنے صرف قرآن کریم ہونا چاہئے' اس کی خالص تعلیم' نیز یہ کہ علوم حاضرہ کی موجودہ سطح تک رسائی اور حالات کے موجودہ تقاضوں کا گہرا علم۔

سورۂ شوریٰ میں ارشاد حضرت باری تعالیٰ ہوتا ہے کہ۔

وما اختلفتم فیه من شئیء فحکمه الی الله۔ (۱۰/۴۲)۔

اور تم لوگ جس چیز میں بھی باہم اختلاف کرتے ہو اس کا فیصلہ خدا کے حوالہ ہے۔

اس آیت کریمہ کی رو سے انسانوں میں جس قدر بھی اختلافات و متنازعہ امور واقع ہوں ان سب کا فیصلہ قوانین خداوندی کے مطابق کیا جانا چاہئے اور ہر وہ کام جس کا فیصلہ قوانین خداوندی کی رو سے کیا جاتا ہے وہ دینی بن جاتا ہے اور اس طرح دین و دنیا کی تفریق جاتی رہتی ہے۔ لیکن یہ صورت صرف اس وقت ہی ہو سکتی ہے

جب کہ کوئی ایسی زندہ اتھارٹی موجود ہو جہاں سے دو فریق اپنے جھگڑے کا فیصلہ کرا سکیں۔ مذہب میں تو ہر شخص خدا کی اطاعت انفرادی طور پر کرتا ہے لیکن دین میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت اجتماعی طور پر ہوتی ہے۔ مذہب میں تو اطاعت کے لئے صرف قرآن کا ہونا ضروری ہے لیکن دین میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے لئے قرآن کریم کے علاوہ ایک زندہ اتھارٹی کا ہونا ازحد ضروری ہے کیونکہ اسلام ایک دین ہے' مذہب نہیں ہے۔ اس لئے اس میں تنہا کتاب کافی نہیں ہے بلکہ اس کتاب کے مطابق اطاعت کرانے والی ایک اتھارٹی کی بھی ضرورت ہے۔ اور یہ اتھارٹی اپنے وقت میں حضورﷺ خود تھے اور آپﷺ کے بعد آپؐ کے خلفاء راشدینؓ وہ زندہ اتھارٹی تھے جو اللہ کی اطاعت کراتے تھے۔

اب یہاں اس مقام پر ایک فیصلہ کن بات سامنے آتی ہے۔ جو لوگ اسلام کو دین کی حیثیت سے اختیار کرتے ہیں' ان کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک زندہ اتھارٹی کی ضرورت بھی تسلیم کریں لیکن جو لوگ رسول اللہﷺ کے بعد زندہ اتھارٹی کی ضرورت کے قائل نہیں ہیں اور اطاعت کے لئے صرف قرآن و حدیث کو کافی سمجھتے ہیں۔ وہ دین اسلام کو مذہب کی سطح پر لے جاتے ہیں اور پھر انفرادی اطاعت کے قائل و پابند ہو جاتے ہیں اور رسول کی اطاعت کو زندہ اتھارٹی کے بجائے حدیث کی اطاعت میں منتقل کر دیتے ہیں۔

مذہب اور دین کے فرق کو مزید نمایاں کرنے کے لئے چند آیات کریمات پیش خدمت ہیں۔ اگرچہ اس سلسلہ میں بے شمار آیات کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔

(۱) کیف تکفرون و انتم تتلیٰ علیکم آیٰت اللہ و فیکم رسولہ (۳/۱۰۱)۔

اور تم کیونکر کافر ہو جاؤ گے حالانکہ تمہارے سامنے خدا کی آیتیں (برابر) پڑھی جاتی ہیں اور اس کے رسول بھی تم میں (موجود) ہیں۔

(۲) فلا وربک لا یومنون حتیٰ یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم حرجا مما قضیت و یسلمو تسلیما (۴/۶۵)۔

پس تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ سچے مومن نہ ہوں گے تاوقتیکہ اپنے باہمی جھگڑوں میں تم کو اپنا حاکم نہ بنائیں پھر (یہی نہیں بلکہ) جو کچھ تم فیصلہ کرو اس سے کسی طرح دل تنگ نہ ہوں بلکہ خوش خوش اس کو بھی مان لیں۔

(۳) ولو انھم اذ ظلموا انفسھم جاءوک (۴/۶۴)۔

جب ان لوگوں نے اپنی جان پر ظلم کیا تھا اگر یہ تمہارے پاس چلے آتے۔

(۴) ویکون الرسول علیکم شھیدا (۲/۱۴۳)۔

اور رسول تمہارے پر نگران ہے۔

یہ اور اس قسم کی دیگر آیات کریمات میں حضورﷺ کو اسلامی نظام حکومت کی ایک جیتی جاگتی' زندہ اتھارٹی کی حیثیت سے مخاطب کیا گیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ نظام کوئی وقتی ہنگامی نظام نہیں تھا۔ بلکہ اس کو آگے بھی چلنا تھا۔ اور یہ بات بھی قطعی وحتمی تھی کہ حضورﷺ کو فوت بھی ہونا تھا۔ اس لئے بالکل ظاہر سی بات ہے کہ حضورﷺ کے بعد ان کے جانشین کو یہ مقام ازخود حاصل ہو جانا تھا اور حضورﷺ کے جانشین کی اطاعت اسی طرح ضروری تھی جس طرح حضورﷺ کی اطاعت تھی۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی اطاعت اسی طرح اللہ و رسول کی اطاعت تھی۔ جس طرح کہ حضورﷺ کی اپنی اطاعت تھی۔ دین کا تصور یہ تھا کہ اسی طرح سلسلہ بہ سلسلہ' زندہ جانشین آتے رہتے اور ان کی اطاعت سے اللہ ورسول کی اطاعت ہوتی رہتی۔ لیکن بدقسمتی سے چونکہ یہ نظام منقرض ہوگیا۔ ملوکیت نے غلبہ پالیا' دین کا نظام ہی درہم برہم ہو گیا۔ بادشاہ وسلطان کی اطاعت رہ گئی دین کی اطاعت ہی نہیں رہی۔ لیکن قرآن کریم میں حضورﷺ کی اطاعت کا بار بار ذکر چلا آرہا تھا اس لئے رسول اللہ کی اطاعت کے لئے بھی کوئی راستہ نکالنا ضروری تھا۔ اس لئے مجبوراً حدیث کی اطاعت کو رسول کی اطاعت قرار دے دیا گیا۔ اور اس طرح زندہ شخصیت کی ضرورت سے بھی جان چھڑا لی اور دین بھی مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ لیکن جب بھی مذہب کے بجائے دین اختیار کرنا ہوگا اس کے لئے لازمی ولابدی شرط ہے کہ پھر زندہ اتھارٹی تسلیم کرنی ہوگی اور حدیث کو صرف دین کی تاریخ کا درجہ دینا ہوگا اور بس۔ لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ ہمارا دوسرا طبقہ جو خلافت اسلامیہ کا داعی ہے وہ اسلام کے نظام کو تو جاری کرنا چاہتا ہے لیکن اللہ ورسول کی اطاعت کے لئے زندہ اتھارٹی کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا۔ بلکہ مذہب اور علماء کے زیر اثر دین کے نظام میں بھی اللہ و رسول کی اطاعت کے لئے صرف قرآن وحدیث پر اکتفا کرتا ہے کیونکہ زندہ اتھارٹی کو ضروری نہیں سمجھتا' لیکن اس طرح دین کا نظام قیامت تک بھی قائم نہیں ہوسکتا۔

البتہ ہمارا تیسرا طبقۂ عالیہ جو خالص قرآن کریم کے نظریات کا حامل ہے اور جو پاکستان میں برابر بڑھتا چلا جارہا ہے وہ اللہ ورسول کی اطاعت کے لئے ایک ایسی زندہ اتھارٹی کو لازمی گردانتا ہے جو مرئی ہو' Visible ہو' اور جو قرآن کریم کے احکامات جاری کر کے' دینی حکومت قائم کر رہی ہو۔ ان حضرات پر یہ بات بخوبی

واضح ہے کہ کسی بھی جھگڑے کے تصفیہ کے لئے زندہ اتھارٹی کا ہونا ضروری ہے۔ حدیثوں یا صحیح الفاظ میں روایات کی کتابوں سے کسی بھی جھگڑے کا تصفیہ نہیں کرایا جا سکتا اور ایک نہایت اہم اور مابہ الامتیاز خصوصیت جو اس قرآنی حلقہ کی ہے وہ یہ ہے کہ صرف اسلامی نظام کے ذریعے ہی اللہ ورسول کی اطاعت ہوتی ہے اور صرف اس نظام کے ذریعے ہی اللہ تعالیٰ اور انسان کا تعلق قائم ہوتا ہے۔ اگر یہ نظام قائم نہیں ہے تو پھر نہ تو اللہ و رسول کی اطاعت ہوتی ہے اور نہ ہی اللہ سے انسان کا کوئی تعلق قائم ہوسکتا ہے۔ اس کے برخلاف ہمارے ہاں سب مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہے کہ بغیر نظام کے بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت قرآن وحدیث کے ذریعے کی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ عقیدہ اگرچہ ہماری بدقسمتی سے' اس وقت دنیا کے سارے مسلمانوں کا ہے کسی کی بھی اس میں استثناء نہیں ہے۔ تاہم یہ عقیدہ قرآن کریم کے بالکل خلاف ہے اور اسی غلط عقیدہ کی بناء پر جو جمہور مسلمانوں میں رائج ہے' مسلمان ذلیل وخوار' مردود ومقہور ہو رہے ہیں اور جب تک اس عقیدہ کو ترک نہیں کریں گے' اس ذلت ورسوائی سے کبھی نہیں نکل سکیں گے۔

ارشاد حضرت باری تعالیٰ ہوتا ہے کہ۔

وان طائفتٰن من المومنین اقتتلوا فاصلحو بینھما فان بغت احدھما علی الاخریٰ فقاتلوا التی تبغی حتی تفیء الی امر اللہ (۴۹/۹)۔

اور اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرا دو پھر اگر ان میں سے ایک فریق دوسرے پر زیادتی کرے تو جو (فریق) زیادتی کرے تم (بھی) اس سے لڑو یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع کرے۔

آیت کریمہ آپ نے ملاحظہ فرمالی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ حکم کس کو ہو رہا ہے کون صلح کرائے۔ صلح کرانے کی تاکید کس کو کی جا رہی ہے۔ اس کا جواب اس کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتا کہ مسلمانوں کی ایک زندہ مرکزی اتھارٹی ہو' جس میں اس درجہ قوت ہو کہ وہ دونوں پارٹیوں کو قوت کے زور سے آپس میں نہ لڑنے دے۔ وہ مرکز ان میں صلح بھی کرائے اور ان میں سے جو فریق بھی زیادتی کرے اس کی قوت کے ذریعے سرکوبی کرے۔ آیت کریمہ اپنی جگہ واضح ہے اور دینی نقطہ نگاہ سے اہمیت کی حامل ہے۔ دینی نقطہ نگاہ سے آیت بالکل واضح ہے۔ اب آپ اس آیت کا وہ مفہوم ملاحظہ فرمائیں جو ہماری روایتی تفاسیر میں مرقوم ہے' وہ تفاسیر جو ''مذہبی'' نقطہ نگاہ سے تحریر کی گئی ہیں۔

۱۔ شیخین نے حضرت انس کی روایت سے بیان کیا ہے کہ ایک دفعہ رسول اللہ گدھے پر سوار ہو کر عبداللہ بن ابی کی طرف تشریف لے گئے۔ عبداللہ نے کہا اپنے گدھے کو ادھر ہی رکھو مجھے آپ کے گدھے کی بدبو سے اذیت ہوتی ہے۔ اس پر ایک انصاری نے کہا خدا کی قسم، رسول اللہ کا گدھا تجھ سے زیادہ خوشبودار ہے۔ یہ بات سن کر عبداللہ کا ایک طرف دار بھڑک اٹھا۔ دونوں باہم سخت سست بکنے لگے۔ ہر ایک کے ساتھی بھی اپنے آدمی کی طرف داری میں غضب آلود ہو گئے۔ یہاں تک کہ قمچیاں چل گئیں، ہاتھا پائی ہوئی اور جوتوں سے لڑائی ہونے لگی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (تفسیر مظہری، قاضی ثناء اللہ پانی پتی۔ جلد ۱۱، صفحہ ۲۲)۔

۲۔ ایک روز حضرتؐ خچر پر سوار ہو کر انصار کے مجمعے میں پہنچے اور وہاں کچھ دیر ٹھہرے رہے۔ آپ کے خچر نے پیشاب کر دیا۔ اس پر عبداللہ بن مسلول نے ناک پر ہاتھ رکھ لیا اور گستاخانہ انداز میں کہنے لگا اس خچر کو یہاں سے ہٹاؤ اس کی بدبو نے دماغ خراب کر دیا ہے۔ عبداللہ بن رواحہ کو یہ بات ناگوار گذری۔ انہوں نے کہا اس کی بدبو تجھ سے اچھی ہے۔ حضرت تو وہاں سے چلے گئے۔ پھر دونوں میں بات بڑھی۔ آخر نوبت ہاتھا پائی تک پہنچی۔ اس کے بعد دونوں قبیلے اوس و خزرج جن کی لڑائیاں مشہور ہیں چڑھ دوڑے اور مار پیٹ شروع ہو گئی۔ جب حضرت کو یہ خبر پہنچی تو آپ پھر تشریف لائے اور دونوں میں صلح کرا دی۔ یہ آیت اس کے متعلق نازل ہوئی ہے۔ انتھٰی۔

☆☆☆

قرآن فہمی کے لئے یہ ایک بات پیش نظر رکھنا نہایت ضروری ہے کہ قرآن کریم اپنی اصطلاحات خود وضع کرتا ہے۔ چنانچہ صلوٰۃ، زکوٰۃ، تقویٰ، تسبیح، رکوع، قرآن کریم کی اپنی اصطلاحات ہیں۔ بے شک یہ عربی زبان کے الفاظ ہیں۔ لیکن عرب ان کو ان معانی میں استعمال نہیں کرتے تھے۔ قرآن کریم نے عربی کے ان ہی الفاظ کو لے کر اپنی اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم میں قانون، حکومت، مملکت، آئین، دستور وغیر کے الفاظ استعمال نہیں ہوئے۔ لیکن ان تمام مفاہیم کو قرآن کریم نے اپنی اصطلاحات کے ذریعے بیان کر دیا ہے۔ قرآن کریم میں ''اللہ و رسول'' کے الفاظ صدہا مرتبہ استعمال ہوئے ہیں۔ ہمارے مفسرین نے ان الفاظ کا لفظی مفہوم لیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے ان دو لفظوں کو اپنی ایک اصطلاح کے طور پر استعمال کیا ہے۔ قرآن کریم کو درست اور دینی نقطہ نگاہ سے سمجھنے کے لئے ان الفاظ کا صرف اصطلاحی معنے لینا ضروری ہے۔ قرآن کریم کو درست طور پر سمجھنے کے لئے یہ نکتہ کلیدی حیثیت رکھتا ہے جس کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے

اور جس کو نظر انداز کرنے سے یہ تمام الجھنیں پیدا ہوتی ہیں اور دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اللہ و رسول سے مراد مرکزِ نظام اسلامی ہے اور یہ حقیقت کہ اللہ و رسول سے مرکز ملت یا اسلامی مملکت کا اقتدار اعلیٰ مراد ہے قرآن کریم میں نہایت واضح الفاظ میں' تفصیل سے بیان فرما دی گئی ہے۔ ان مقامات کو بغور پڑھ لینے سے اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ اس کے لئے قرآن کریم سے بہت سی شہادات پیش کی جا سکتی ہیں' لیکن یہاں صرف چند مثالوں پر اکتفاء کیا جاتا ہے' مثلاً جب جنگ احد میں مسلمانوں کی فوج پسپا ہوگئی اور نہایت افراتفری کا عالم ہوگیا تو حضورﷺ نے صحابہؓ و مجاہدین کو آواز دی اور اس آواز پر وہ پھر جمع ہو گئے۔ بظاہر یہ آواز حضور کی تھی لیکن چونکہ یہ پکار حضور کی ذاتی نہیں تھی بلکہ آپ نے سربراہ مملکت کی حیثیت سے دی تھی اس لئے اس آواز کو 'اللہ و رسول' کی آواز قرار دیا گیا ہے۔

۱۔ الذین استجابوا للہ والرسول من بعد ما اصابھم القرح' للذین احسنوا منھم واتقوا اجر عظیم (۳/۱۷۲)۔

جن لوگوں نے اللہ اور اس کے رسول کی پکار کا جواب دیا باوجودیکہ وہ زخم کھا چکے تھے' سو یاد رکھو ان میں جو لوگ متقی ہیں یقیناً ان کے لئے بہت بڑا اجر ہے۔

۲۔ یہودیوں نے مدینہ میں اس عہد کو توڑا تھا جو انہوں نے حضورﷺ سے کیا تھا۔ اس غداری کو 'اللہ و رسول' کی مخالفت قرار دیا گیا ہے' کیونکہ یہ مخالفت اسلامی نظام کی مخالفت تھی ذلک بانھم شاقوا اللہ و رسولہ ومن یشاقق اللہ فان اللہ شدید العقاب (۵۹/۴)۔ یہ اس لئے ہے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی اور جو کوئی اللہ کے حکم کی مخالفت کرتا ہے تو اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

۳۔ ان الذین یؤذون اللہ و رسولہ لعنھم اللہ فی الدنیا والاخرۃ و اعدلھم عذابا مھینا (۳۳/۵۷)۔

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت دیتے ہیں۔ ان کے لئے دنیا و آخرت میں ذلت آمیز عذاب ہے اور اللہ کی لعنت۔

اس سلسلہ میں مزید آیات کا تحریر کرنا طوالت کا باعث ہوگا۔ آپ اپنے نسخوں میں مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ فرمالیں۔ (۲۴/۶۳)' (۱۔۴/۵۹)' (۸/۴۶)' (۹/۱۰۷)' (۸/۱۳)' (۵۸/۵)' (۵۸/۲۰)' (۳۳/۳۶)' (۵۹/۸)' (۹/۶۲)' (۹/۷۴)'

(۲۰/ ۸)۔ان تمام آیات کریمات کو بغور دیکھنے کے بعد یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ 'اللہ و رسول' سے مراد اسلامی حکومت کی مرکزی زندہ اتھارٹی ہوتی ہے اور اس کی اطاعت سے 'اللہ و رسول' کی اطاعت ہوتی ہے اور اللہ و رسول کی اطاعت کا یہ ہی واحد ذریعہ ہے' اس کے علاوہ کسی اور طریقے سے اللہ و رسول کی اطاعت نہیں ہو سکتی۔

ہمارے ہاں چوتھا طبقہ وہ ہے جو ان مفکرین و دانشوروں پر مشتمل ہے جو لبرل' سیکولر اور Leftist کہلاتے ہیں۔ یہ حضرات ٹی۔وی چینلز پر مباحثوں میں بھی حصہ لیتے ہیں۔ عام طور پر ان مباحثوں میں یہ حضرات Offensive Attitude لیتے ہیں' جبکہ ان کا Counter Part جو مذہب کے نمائندے ہوتے ہیں وہ Apologetic Attitude رکھتے ہیں۔ ہمارے ملک کی بیشتر آبادی چونکہ مسلمان ہے۔ اس لئے یہ حضرات ان علمی مباحثوں میں محتاط ہوتے ہیں اور جو ان کے دل میں ہوتا ہے وہ زبان پر نہیں لاتے۔ قد بدت البغضاء من افواههم وما تخفی صدورهم اکبر (۳/ ۱۱۸)۔ دشمنی تو ان کے منہ سے ٹپکی پڑتی ہے اور جو (بغض وحسد) ان کے دلوں میں بھرا ہے وہ کہیں اس سے بڑھ کر ہے' اگرچہ وہ اس دوران True Colours میں نہیں آتے تاہم ان کی گفتگو میں استہزاء اور استخفاف نمایاں ہوتا ہے اور عموماً مسلمانوں کی تاریخ' روایات اور خلاف قرآن مولویانہ عقائد کو Exploit کرتے ہیں۔ اور ہمارا مذہبی طبقہ عموماً پسپا اور معتذرانہ رہتا ہے۔ تمام گفتگو کا ماحصل یہ ہوتا ہے کہ اسلام کو بطور مذہب نجی زندگی تک محدود رکھنا چاہئے' اپنی پرائیویٹ زندگی اس کے مطابق گذارنی چاہئے لیکن مذہب کا کوئی تعلق سٹیٹ سے نہیں ہونا چاہئے۔ مملکت سیکولر ہونی چاہئے۔ چرچ اور سٹیٹ' یا مسجد و مملکت الگ الگ ہونی چاہئے' ان کے دوائر ایک دوسرے سے بالکل متبائن ہونے چاہئیں۔

اصل یہ ہے کہ ان حضرات کے سامنے یورپ کی تاریخ اور یورپ میں مذہب کا کردار (Role) ہوتا ہے۔ یورپ عیسائی مذہب کی وجہ سے تاریکی میں ڈوبا رہا اور جب اس نے مذہب سے جان چھڑالی اور خالص سیکولر نظام قائم کر دیا تو اس نے ترقی حاصل کر لی جو ہمارے سامنے ہے۔ ہماری صورت یہ نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں ہمیں یہ بات ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہئے کہ عیسائی مذہب کا یہ دعویٰ ہی نہیں تھا کہ وہ ایک نظام حیات پیش کرتا ہے وہ تو خود اپنی تعلیم کو نجی' پرائیویٹ معاملہ قرار دیتا ہے جس پر انفرادی طور پر عمل کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ آپ نے اس مضمون میں غور فرمایا ہوگا کہ اسلام تو ایک دین ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ اس دنیا میں انسانوں کے باہمی تنازعات

اور جھگڑے قرآن کے احکامات کے مطابق طے کئے جانے چاہئیں۔ وما اختلفتم فیہ من شئ فحکمہ الی اللہ (۴۲/۱۰)۔ اورتم لوگ جس چیز میں بھی باہم اختلاف کرو' تو اس کا فیصلہ اللہ کے قانون کے مطابق ہے۔ اس میں اللہ ورسول کی اطاعت ہی اس نظام کی معرفت ہوتی ہے جو قرآن کریم قائم کرتا ہے۔ مذہب کو تو نجی معاملہ قرار دیا جا سکتا ہے' لیکن دین کو ذاتی نہیں بنایا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ چونکہ ان حضرات کے سامنے مذہب اور دین کا فرق واضح نہیں ہے اس لئے یہ حضرات یہ تجویز پیش کرتے ہیں۔ مزید یہ کہ یورپ کی تاریخ اور اس میں عیسائیت کا کردار ان کو مزید Mis-Guide کرتا ہے۔ ورنہ ان حضرات کے خلوص' ایثار اور قوم سے محبت کرنے میں کوئی شک نہیں۔ آخر یہ ہمارے میں سے ہی ہیں۔ اور اس غلط فہمی میں مبتلا ہونے میں بھی یہ حضرات خود ذمہ دار نہیں ہیں۔ جب کہ ہمارا علماء کرام کا گروہ ہی مذہب اور دین کے فرق کو نہیں سمجھتا۔ تو یہ حضرات کیسے سمجھ سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں غدر کے ہنگامہ کے بعد عیسائی پادری غول در غول اور فوج در فوج ہندوستان میں وارد ہوئے۔ وہ یہاں کی آبادی کے ساتھ مناظرے کرتے تھے اور یہاں کے لوگوں کو عیسائی بنانے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ گورنمنٹ کی نگرانی میں یہ مناظرے دیگر مقامات کے علاوہ دہلی میں فوارہ چوک پر ہوتے تھے۔ اس میں پادری فنڈ اور (غالباً) پادری Sale وغیرہ حصہ لیتے تھے۔ ہنود کی جانب سے رامچندر شیور مناظر تھے۔ علماء کرام میں حضرت اقدس' زبدۃ العلماء مولانا نانوتوی اور خاص طور پر مولانا رحمت اللہ کیرانوی پیش پیش ہوتے تھے۔ مناظروں میں کبھی فیصلہ نہیں ہوا کرتا اور نہ ہی مناظرہ حق و باطل کا کوئی معیار ہے یہ تو صرف ایک طرح کی Mental Gymnastic ہے اور اس کے داؤ پیچ بھی ہیں جس پر عمل کرنے سے باطل مذہب کا نمائندہ بھی جیت سکتا ہے۔ ان مناظروں میں ہمارے علماء کرام اسلام کو بحیثیت مذہب کے ہی پیش کرتے تھے اور اسلام کا عیسائیت سے تقابل کرتے تھے اگر ان حضرات کے سامنے اسلام بطور دین کے ہوتا تو یہ حضرات اسلام کا تقابل جمہوریت سے کرتے اور یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کرتے کہ اسلام کا نظام جمہوریت کے نظام سے بہت بہتر ہے۔ لیکن افسوس کہ ہمارے علماء کرام نے اسلام کا تقابل عیسائیت سے کیا اور اسلام کو مذہبی سطح تک ہی رکھا۔

اب بھی ہمارے دینی مدارس اور یونیورسٹی کے اسلامیات کے شعبوں میں تقابل مذاہب A Comparative Study of Religions میں جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان میں اسلام کا تقابل ان مذاہب سے ہی ہوتا ہے۔ جب یہ صورت حال ہو تو ان

لبرل خیالات کے حامل افراد کا کیا قصور ہے۔

برطانیہ میں آج کل بیک وقت مذہب اور دین دونوں جاری ہیں۔ان کے ہاں عیسائیت بطور مذہب کے ہے جو پرائیویٹ ہے اور جمہوریت ان کے ہاں دین کے طور پر رائج ہے۔عیسائیت کو تو آپ ذاتی نجی قرار دے سکتے ہیں لیکن کیا جمہوریت کو بھی نجی قرار دے کر کوئی اور متوازی نظام جاری کیا جا سکتا ہے۔اسی طرح اسلام کی مثال ہے۔اسلام بطور دین کے جاری کرنے کے بعد نہ تو آپ اس کو ذاتی قرار دے سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی اور نظام ساتھ ساتھ اس کے متوازی جاری کر سکتے ہیں۔

قرآن کریم نے ملکیت زمین کو قطعاً حرام قرار دیا۔اس کی خرید وفروخت بالکل حرام ہے۔امام ابوحنیفہؒ اور امام جعفر صادقؒ دونوں حضرات ملکیت زمین کی حرمت کے قائل تھے۔البتہ بنوعباس کے دور میں جب دین کا نظام منقرض ہو چکا تھا۔بادشاہوں کے زیر اثر سرکاری فقہا نے اس کی ملکیت کو جائز قرار دے دیا۔اگر اسلام کو بطور دین کے جاری کیا جائے تو ظاہر بات ہے کہ زمین کی ملکیت بھی حرام ہو جائے گی۔آپ اس قانون کو کس طرح ذاتی ونجی قرار دے سکتے ہیں۔قرآن کریم نے اپنے منفرد سیاسی، معاشی، عدالتی، مالی قوانین عنایت فرمائے ہیں اور ان پر عمل کرنا فرض قرار دیا ہے۔ان تمام قوانین کو آپ کس طرح ذاتی بنا سکتے ہیں۔یہ تمام غلط فہمی صرف اس وجہ سے ہو رہی ہے کہ ان حضرات کے سامنے اسلام بطور مذہب کے ہے اور عیسائیت کو مثال بنا کر اپنے سامنے رکھنے سے مزید گمراہی ہوتی ہے۔

جہاں تک قائداعظم علیہ الرحمتہ کا تعلق ہے ان کے متعلق بھی ۵۷ سال سے یہ بحثیں ہو رہی ہیں کہ وہ سیکولر حکومت چاہتے تھے یا مذہبی حکومت کے خواہاں تھے۔ قائداعظم کے سلسلہ میں عرض ہے کہ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ ان کی بے شمار تقاریر ایسی ہیں جن میں انہوں نے فرمایا تھا کہ پاکستان کی مملکت قرآنی اصولوں پر مبنی ہوگی۔ سن ۱۹۴۰ء میں انہوں نے حیدرآباد دکن میں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء کو جو انٹرویو دیا تھا وہ تو بہت ہی واضح ہے۔اس انٹرویو میں طلباء نے ان سے سوال کیا تھا کہ اسلامی حکومت کی وہ کیا خصوصیت ہے جس سے وہ دیگر حکومتوں سے ممیّز ہو جاتی ہے اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا تھا کہ اسلامی حکومت کی یہ منفرد خصوصیت ہے کہ اس حکومت میں آزادی و پابندی کی حدود قرآن متعین کرتا ہے۔لیکن اس کے ساتھ ساتھ ان کی ۱۱ اگست کی تقریر بھی موجود ہے۔یہ تقریر انہوں نے کسی سڑک کے کنارے یا کسی الیکشن کے جلسے میں نہیں کی تھی بلکہ دستور ساز اسمبلی میں فرمائی تھی۔اس بات سے اس تقریر کی اہمیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔یہ تقریر ان کی گذشتہ تقاریر کی تائید نہیں کرتی۔اس لئے قائداعظم سے منسوب یہ دونوں

نظریات چلے آ رہے ہیں اور دونوں گروہ اپنی سند میں قائداعظم کی تقریر کے حوالے دے رہے ہیں۔

قائداعظم تھیاکریسی کے مخالف تھے اور ہر جگہ انہوں نے تھیاکریسی کی ہی مخالفت کی ہے۔لیکن وہ قرآنی مستقل اقدار کے خلاف نہیں تھے اور بار بار انہوں نے قرآنی اصولوں کا حوالہ اسی وجہ سے دیا ہے۔تھیاکریسی میں علماء کے وضع کردہ قوانین' اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر کے جاری کئے جاتے ہیں۔جو سابقہ ادوار کے تدوین کردہ اورفرسودہ ہوتے ہیں۔لیکن قرآنی حکومت یا دین میں تو صرف قرآن کریم کی مستقل اقدار پیش نظر ہوتی ہیں اورروز بروز نئے نئے قوانین حالات کے مطابق وضع کئے جاتے ہیں۔ پاکستان کے قیام سے پیشتر قرآنی حکومت کا یہ تصور عام نہیں تھا۔اس وقت سیکولر نظام کے مقابلہ میں تھیاکریسی کو ہی خیال کیا جاتا تھا۔قرآنی حکومت کا تصور پاکستان کے قیام کے بعد خالص قرآنی فکر کے حامل علماء و دانشوروں نے پیش کیا اوراس کے بعد تحریک طلوع اسلام نے اس کو عام کیا اوراس موضوع پر اس قدر مواد فراہم کیا کہ آج دنیا کے تمام ممالک میں یہ فکر بہت تیزی سے پھیل رہی ہے۔ یہی وہ تصور ہے جس کی طرف قائداعظمؒ نے اپنی تقاریر میں بار بار اشارہ کیا ہے۔

اگر برسبیل تنزل یہ بات درست تسلیم کر لی جائے کہ قائداعظم یہاں سیکولر سٹیٹ کے قیام کے خواہاں تھے تو اس سلسلہ میں عرض ہے کہ مسلمانوں کو تو صرف قرآن کے اتباع کا حکم ہے۔اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہٖ اولیاء (۳/۷)۔ اور جو تمہارے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔قائداعظم کا یقیناً ہم پر بہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے ہمارے لئے ایک اتنا بڑا ملک حاصل کیا۔لیکن ان کے اس احترام وعظمت کے باوجود قرآن کریم کے حکم کو کسی طرح نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن کے علاوہ کسی کا بھی حکم حجت نہیں ہے۔ قرآنی تعلیم کے مطابق تو خود حضورﷺ کا قول بھی حجت نہیں ہے۔قرآن میں عام مومنین کو مشاورت کا حکم ہے۔ وامرھم شوریٰ بینھم (۴۲/۳۸)۔ اوران کے کل کام آپس میں مشورے سے ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح خود حضورﷺ کو بھی مشورہ کرنے کا حکم تھا وشاورھم فی الامر (۳/۱۵۹)۔ ان سے کام میں مشورہ کر لیا کرو۔ مشاورت کی اساس یہ ہے کہ خود مستشر کو اپنی بات پر حتمی وقطعی اعتبار نہیں ہے اس لئے وہ دوسروں سے مشورہ کر رہا ہے کیونکہ اگر مستشیر کو اپنے قول پر پورا اعتماد ہو اوراس پر اصرار ہو تو پھر اس میں مشاورت کی کیا ضرورت؟ مشاورت کرنے کے بعد کبھی مستشیر کا قول اختیار کیا جاتا ہے اور کبھی مستشار کے قول کو ترجیح دی

جاتی ہے۔ جب حضورﷺ کو مشاورت کا حکم تھا تو ان کا قول حجت نہیں ہوسکتا اس کے علاوہ حضرت زیدؓ کا قصہ اور سورۃ مجادلہ کی پہلی آیت اس مضمون پر دلالت کرتی ہے کہ قول رسول حجت نہیں ہے۔ یہاں چونکہ یہ موضوع نہیں ہے' اسی پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔ جو حضرات اس بارے میں متردد ہوں وہ راقم سطور کا مضمون ''دین میں حدیث کا مقام'' ملاحظہ فرما لیں۔ جب قول رسول ہی حجت نہیں ہے تو اس اصول کا اطلاق سب شخصیات پر ہوگا خواہ وہ شخصیت کتنی ہی قابل احترام ہو۔ ایک مستحکم اصول یہی ہے کہ لا طاعۃ المخلوق فی معصیت الخالق۔ اللہ تعالیٰ کی اطاعت اولین فرض ہے' خواہ اس سے کسی کی بھی مخالفت کیوں نہ ہو رہی ہو۔

وآخر دعوٰھم ان الحمدللہ رب العالمین (۱۰/۱۰)۔

اوران کا آخری قول یہ ہوگا کہ سب تعریف خدا کو ہی سزاوار ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# گنگا رام ہسپتال/طلوع اسلام سینٹر

ضلع فیصل آباد میں ریلوے سٹیشن بچیانہ سے تین میل کا ایک ریلوے ٹریک گنگا پور تک سر گنگا رام نے قیام پاکستان سے قبل بنوایا تھا۔ اس پر دو گھوڑے مسافروں سے بھری ہوئی ٹرالیوں کو اچھی خاصی رفتار سے چلاتے ہیں۔ گاڑیوں کی آمد و رفت کے مطابق یہ گھوڑوں والی ریل آج بھی ریلوے سٹیشن پر گاؤں آنے جانے والے مسافروں کی سہولت کے لئے موجود رہتی ہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ لاہور سے دو تین ہندو لڑکے اسی ٹریک پر ٹرالیوں میں بیٹھ کر گاؤں آئے اور سر گنگا رام کی بیوی کو بتایا کہ وہ لاہور میں ایک فری ڈسپنسری قائم کرنے کے لئے چندہ جمع کرنے کی مہم پر نکلے ہیں اور اسی غرض کے لئے آپ کے پاس آئے ہیں۔ خاتون نے چند ایک سوالات کئے اور ایک چیک کاٹ کر لفافہ میں بند کر کے دے دیا۔ نوجوانوں نے ریلوے سٹیشن پر پہنچ کر لفافہ کھولا تو اس میں ایک لاکھ روپے کا چیک تھا اتنی بڑی رقم کا عطیہ ملنے کی امید ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔ اس زمانہ میں تین روپے من گندم کا نرخ تھا۔ وہ اسی گھوڑا گاڑی پر بیٹھ کر واپس خاتون کے پاس آئے تو اس نے کہا کہ تم اللہ کا نام لے کر کام تو شروع کرو مزید سرمایہ بھی لوگ دیں گے۔ نوجوانوں کے اصرار پر بیوہ خاتون نے کہا کہ اگر اس پراجیکٹ کے ساتھ اس کے مرحوم شوہر کا نام آ جائے تو اسے سکون ملے گا۔ اس طرح گنگا رام ہسپتال کی بنیاد رکھ دی گئی جو آگے چل کر لاہور کا بہت بڑا ٹیچنگ ہسپتال بنا۔ جو دنیا کے شاید واحد ویمن میڈیکل کالج یعنی فاطمہ جناح میڈیکل کالج کے ساتھ منسلک ہے۔

میں ان چند سطور کے ذریعہ اس عظیم انسان کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں۔ جس نے فیصل آباد اور شیخوپورہ کی کچہریاں۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے کئی بلاکس۔ جنرل پوسٹ آفس۔ ہائیکورٹ۔ میوزیم۔ ہیلی کالج آف کامرس۔ ماڈل ٹاؤن رینالہ خورد کے پاس گنگا رام نہر اور بجلی گھر جیسی عظیم تعمیرات مکمل کروائیں یہ غریب لڑکا مانگٹا نوالہ کے گاؤں میں ہندوؤں کی نچلی ذات کے

ویش گھرانے میں پیدا ہوا۔ بیواؤں سے متعلق مولانا حالی کی نظمیں بڑے ذوق وشوق سے پڑھا کرتا تھا۔خواجہ حسن نظامی نے دعا کی کہ اس کی عمر بھی اس عظیم انجینئر کو لگ جائے۔ جو۱۹۲۴ء میں تہتر برس کی عمر میں فوت ہوگیا۔ان کی نواسی ہاؤس آف لارڈز کی ممبر ہے اور وہ گنگارام ہسپتال کے لئے باقاعدگی سے عطیات بھیجتی ہے۔ اس دردِ دل رکھنے والے انجینئر کا نام آج بھی زندۂ جاوید ہے۔ دن میں سینکڑوں اومنی بسیں جب اس ہسپتال کے سٹاپ پر پہنچتی ہیں تو کنڈیکٹر آواز لگاتے ہیں ''گنگارام آ گیا'' ہسپتال کا لفظ حذف کر جاتے ہیں۔ کیونکہ وہ سب کومعلوم ہے۔ اگرچہ وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔مگر دن میں سینکڑوں بار اس کا نام لے کر اس کی آمد کا اعلان ہوتا ہے۔ جسے ہزاروں لوگ سنتے ہیں۔لطف کی بات تو یہ ہے کہ اس عظیم انسان کا نام بڑی عزت اور وقار سے لیا جاتا ہے۔کبھی کسی نے ''گنگو آ گیا'' کہہ کر نہیں پکارا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ عوامی فلاح و بہبود کے ایسے یادگار تعمیراتی کام کر جانے والوں کے نام کبھی فراموش نہیں ہو سکتے۔

لاہور کی مشہور تاریخی نہر کے کنارے جلوموڑ کے قریب لاہور میڈیکل اینڈ ڈینٹری کالج سے ملحقہ سولا (۱۶) مرلے زمین پر محیط ایک تین منزلہ عظیم الشان عمارت زیرِتعمیر ہے۔اس طلوع اسلام سینٹر میں قریباً آٹھ سو نشستوں کا وسیع ہال بھی ہے۔ جہاں سالانہ کنونشن کے علاوہ دیگر اجتماعات منعقد کرنے میں بڑی آسانی ہوگی باہر سے آنے والے مہمانوں کے قیام وطعام کا انتظام بھی ممکن ہو سکے گا۔ بشرطیکہ فرشی بستروں کا استعمال ہو۔علاوہ ازیں اس سینٹر میں درس وتدریس اور ریسرچ کا کام بھی کیا جائے گا۔ یہ کشادہ۔خوبصورت بلڈنگ مستقبل کی کم از کم پچاس سالہ ضروریات کی کفیل ہوگی۔

میں چند روز پہلے گیا تو کام بند پڑا تھا۔محترم اشرف ظفر صاحب اس عظیم پراجیکٹ کی تکمیل کے لئے دیوانہ وار سرگرم عمل ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ فنڈز ختم ہو گئے ہیں اور کام آخری مراحل پر ہے۔جس پر قریباً دس لاکھ روپے خرچ کا اندازہ ہے۔ مالی مشکلات کے باوجود کوالٹی کے معیار کو بحال رکھا گیا ہے آئندہ کبھی ضرورت محسوس ہوتو دو تین مزید منزلیں بھی تعمیر کی جاسکیں گی۔ مجھے توقع تھی کہ ستمبر کے آخری دنوں میں ہم وہاں سالانہ کنونشن منعقد کریں گے۔ یہ امید تو پوری ہوتی نظر نہیں آتی لہٰذا اب ہم کنونشن کے پروگرام کو اپریل میں کرلیں گے۔ اس پراجیکٹ میں محترم غلام باری اور محمد اشرف جیسے مخیّر حضرات نے دل کھول کر مالی تعاون کیا ہے۔ اگر ان کو اعتراض نہ ہوتو میری تجویز یہ ہے کہ اس وسیع وعریض سینٹر کے مین گیٹ پر یا ہال میں ایک ٹاپ ٹین آنر بورڈ لگایا جائے۔جس پر ترتیب وار دس بڑے اور چیدہ چیدہ مالی

تعاون کرنے والوں کے نام درج ہوں تا کہ یہ امر ہو جائیں اوراس سے آئندہ آنے والی نسلوں کوایسے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی ترغیب ملتی رہے۔ میں مخلص اور دردِ دل رکھنے والے احباب سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ اپنے عطیات جلد بھیج دیں تا کہ بلڈنگ کا تعمیراتی کام مکمل ہو سکے۔ اگر مطلوبہ فنڈز سے کچھ زیادہ رقم موصول ہوئی تو ہم ہال کے لئے فرنیچر وغیرہ خرید لیں گے۔ ان کی یہ امداد صدقۂ جاریہ ہوگی۔

عطیہ دینے والے احباب یہ مت خیال کریں کہ وہ کوئی بڑی رقم دینے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ قطرہ قطرہ بہم می شود دریا۔ پانی کا ایک ایک قطرہ جمع ہوکر سمندر بن جاتا ہے۔ ریت کا ایک ایک ذرہ باہم مل کر صحرا کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ بازارِ مصر میں ایک بڑھیا نے سوت کی ایک اٹی لے کر یوسف علیہ السلام کے خریداروں میں شامل ہونے کا شرف حاصل کر لیا تھا۔ آپ کی چھوٹی سے چھوٹی رقم بھی بڑے عطیات میں شامل ہوکر اس عظیم الشان پراجیکٹ کی تعمیر میں حصہ لینے والوں کی فہرست میں آپ کا نام بھی تو آ جائے گا۔ یہ بہت بڑا اعزاز ہے۔ یہ زریں موقعہ شاید ہی پھر آئے۔ اس کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔

محمد شریف لون
چیئرمین ادارہ طلوع اسلام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جمیل احمد عدیل

# مسئلہ جنات

## (گذشتہ سے پیوستہ)

مندرجہ صدر آیات کی رُو سے یہ تصریح ضرور ہوتی ہے کہ انسانوں سے قبل ایک ایسی مخلوق موجود تھی جسے جنات سے موسوم کیا گیا ہے۔ اس ہسٹری کے مطابق اس مخلوق کا نمائندہ 'ابلیس' تخلیقِ آدم کے سے بھی بظاہر موجود تھا۔ جس نے اپنے تفوق کے حق میں یہ دلیل تراشی کہ آدم مٹی سے خلق ہونے کے سبب فروتر ہے جبکہ میں ناری مخلوق ہونے کے باعث اس سے افضل ہوں۔

ایک روشن بصر مفکر قرآن نے یہ نقطہ نظر پیش کیا ہے:

''جب یہ کرۂ ارض سورج سے الگ ہوا ہے تو ایک پگھلا ہوا آتشیں مادہ تھا۔ قرنہا قرن کے بعد فضا کی برودت سے اس کا اوپر کا حصہ سخت ہونا شروع ہوا۔ جیسے دودھ پر بالائی جم جاتی ہے لیکن نہ معلوم اس کرۂ نار کو کس قدر طویل المیعاد مراحل میں سے گزرنا پڑا کہ بالآخر یہ ذی حیات آبادی کے قابل ہوا۔ تبدیل و تحول کے ان ابتدائی ادوار میں یہاں کس قسم کی مخلوق تھی جسے اس کی آتشیں فضا سازگار تھی۔ اس کا ہمیں علم نہیں۔ لیکن وہ مخلوق اب قصۂ پارینہ ہو چکی ہے۔ اس کی جگہ انسانی آبادی نے لے لی۔ علم الانسان کے ماہرین اسے سلسلۂ ارتقاء کی گمشدہ کڑی (Missing Link) سے تعبیر کرتے ہیں جس کا اب تک حتمی طور پر سراغ نہیں لگ سکا۔ اس مخلوق سے آج ہمارا تعلق اس کے سوا اور کچھ معلوم نہیں کہ قرآن کریم نے اس کا ذکر کیا ہے جس پر ہمارا ایمان ہے۔''

ایک اور مفسر قرآن نے بھی اسی سے ملتا جلتا موقف پیش کیا ہے:

''ممکن ہے پہلے انسان ناری وجود ہو اور زمانہ کے تغیرات سے بدلتے ہوئے ارتقاء کے ماتحت طینی وجود ہو گیا ہو۔ یعنی اس کی بناوٹ کی بنیاد زمینی پیداوار پر آ گئی ہو۔ اور ایسے وجود جو سب سے پہلے تیار ہوئے۔ ان کا سردار آدم ہو یہ کوئی بعید بات نہیں۔ علم جیالوجی سے یہ امر ثابت ہے

کہ دنیا میں مٹی کا چھلکا بعد میں بنا ہے۔ پہلے دنیا ایک گرم آگ کا کرہ تھی۔ سوا رتقاء کے لحاظ سے اگر طینی ابتدا سے پہلے انسان کی ابتدا ناری وجود سے تسلیم کی جائے تو مستبعد نہیں۔ مگر یہ امور تخمینی ہیں۔ ان کو یقین سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔''

اس میں شک نہیں کہ موجودہ سائنس تصدیق کرتی ہے کہ کروڑوں اربوں برس قبل آفتاب ایک TOP کی طرح گردش کرتے کرتے اپنے چند انگاروں کی رفاقت سے محروم ہو گیا لیکن اس کے یہ آتشیں رفقاء نے اپنی نسبت قائم رکھی کہ اپنے Orbit میں خورشید کے گرد چکر کاٹتے رہے۔ اسی خورشید جہاں تاب سے جدا ہونے والے آگ کے گولوں میں سے ایک گولہ زمین سے معنون ہوا۔ اس کی حدت' حرارت دو چار برس نہیں کروڑوں سال برقرار رہی۔ رفتہ رفتہ یہ آگ ٹھنڈی پڑنی شروع ہوئی۔ اس دہکتے ہوئے وجود کو کچھ قرار ملا تو کرۂ ہوائی کی اک صورت پیدا ہوئی۔ یہ ہوا کی مہربانی تھی جس نے موسموں کو جنم دیا۔ موسموں کے توسط سے بادلوں کی تشکیل ہوئی۔ بادل پانی بن کر برسے۔ زمین اب اس بارانِ رحمت سے نشیب و فراز سے ہمکنار ہوئی تو کہیں دریا بہہ نکلے' کہیں قلزم اپنا آپ منوانے لگے تو کہیں کوہساروں نے اپنا تشخص ثابت کر ڈالا۔ ظاہر ہے اس مقام پر ٹھنڈی مٹی نے زرخیزی کی صفت اپنے اندر پیدا کی' یوں نباتات کی وجود پذیری کے امکانات موجیں مارنے لگے۔

سائنسدانوں نے آگے چل کر کچھ اس طرح رہبری کی ہے کہ زیست کی صورت گری کا اولین مرحلہ پتھر ہیں۔ نباتات کو وہ دوسرا مرحلہ شمار کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ نباتات زندگی کے اجزاء یعنی بڑھوتی' ہوا' پانی اور روشنی کے ساتھ اپنا نامیاتی تعلق واضح طور پر ظاہر کرتے ہیں۔ نباتات سے آگے ارتقاء کا اگلہ زینہ حیوانی حیات کو قرار دیا گیا ہے۔ جو متعدد مرحلوں کو طے کر کے Two Leged Animal یعنی حضرت انسان تک پہنچا ہے۔ پھر انسان کی دماغی صلاحیتیں پہلے ہی دن پیدا نہیں ہو گئیں جانے اس Evolution نے کتنی صدیوں کی غذا سے استفادہ کیا ہے؟ ابن مسکویہ بتا سکے نہ ڈارون ہی کچھ راہنمائی کر سکا ہے۔

ظاہر ہے کروڑوں برس کی اس تاریخ کو ٹکڑوں کی شکل میں دیکھنے کی اب جا کر کے انسان میں کچھ اہلیت پیدا ہوئی ہے۔ ان ٹکڑوں کو ترتیب دینے کی استعداد ابھی جانے وقت کی کتنی جھیلوں کا پانی ہضم کرے گی' پھر ہی خدوخال وضاحت سے سامنے آ سکیں گے۔ ایسے میں ہم اس کے سوا کیا کہہ سکتے ہیں کہ آتشیں دور میں آتشیں خوراک کھانے والی ایک آتشیں مخلوق کا امکان ہو سکتا ہے کہ شعلہ صفتی جن کی خلقت سے گہرا تعلق رکھتی ہے۔۔۔

مگر اہم تر سوال یہ ہے کہ نار سے خلق ہونے والے جنات اب کہاں ہیں؟ اگر تو قرآن میں مذکور جملہ جنات وہی قدیم ناری مخلوق کا تسلسل ہیں تو انسانوں کے مقابل اس متوازی مخلوق کو کم از کم قرآن مجید تسلیم نہیں کرتا۔

اب ہمارے پاس ایک ہی راہ رہ جاتی ہے کہ مانا جائے Obviously جنات کی دو بڑی بڑی اقسام ہیں۔

۱۔ انسانوں کی موجودہ ہیئت سے قبل آگ کے زمانے کی آتشیں مخلوق جس کا اب کہیں نام ونشان موجود نہیں ہے۔

۲۔ انسانوں کو بعض خصوصیات کی بنا پر جنات سے موسوم کیا گیا ہے جو انبیاء ومرسلین سے ہر دور میں متعلق رہے ہیں۔

☆☆☆

واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں لفظ ''جن'' کم و بیش چالیس مرتبہ استعمال ہوا ہے اور سیاق وسباق کے اعتبار سے مختلف جگہوں پر کسی قدر مختلف مفاہیم میں استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ Perspective کو نظرانداز کرنے سے پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔ دراصل ان تمام مقامات کو باہم مربوط کرنے سے مسئلہ حل ہوگا۔

مثلاً سانپ کو بھی جن کہا گیا ہے۔ سورۃ نمل کی آیت نمبر دس ملاحظہ فرمائیں۔ اسی طرح سورۃ قصص کی آیت نمبر اکتیس کا مطالعہ کیجئے۔ ایک صاحب لکھتے ہیں۔ ''اس سفید سانپ کو بھی جو سرمگین آنکھوں والا ہو جان کہتے ہیں۔ ایسے سانپ میں زہر نہیں ہوتا اور وہ کاٹتا نہیں''۔

قصہ مختصر محولہ دو واضح تقسیموں کو مدنظر رکھ کر دیکھا جائے تو ایک بڑا لطیف اور ذوقی نکتہ ہمارے ہاتھ آتا ہے کہ سطح ارض سے عنقا ہو جانے والی آگ سے بنی مخلوق کو بطور علامت قرآن نے بار بار بیان کیا ہے اور انسان کی ناری جہت کو اس Symbolism میں کچھ ایسی لطافت اور گہری معنویت سے نمایاں کیا ہے کہ قرآن کے اسلوب اور طرز ادا کی بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے۔ مثال کے طور پر تخلیق آدم کے تمثیلی واقعہ میں منکر کردار کے مزاج کو ہائی لائٹ کرنے کے لئے، جی ہاں اس کی آتش مزاجی اور ہٹیلے پن کی صراحت کے لئے کہا کہ ''ابلیس جنوں میں سے تھا''۔ اور خود ابلیس اقراری ہے کہ میرے انکار کا سبب ہی میرا ناری ہونا ہے۔ گویا انکار عظمت آدم ابلیسی صفت ہے۔ جناتی خصوصیت ہے اور یہ جن کبھی راون کی صورت میں نمودار ہوا، کبھی فرعون ونمرود اور کبھی ابوجہل وابولہب کی شکل میں وجود پذیر ہوا اور ہر دور کے ابلیس نے اپنے وقت کے آدم کی اطاعت سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس کا موقف شروعات سے یہی رہا ہے کہ میں ''نار'' سے خلق ہونے کی وجہ سے برتر اور یہ ''مٹی'' سے خلق ہونے کے

سبب کم تر ہے اور برتری کی یہ 'نار' کبھی نشۂ اقتدار کی شکل میں جلوہ گر ہوتی ہے تو کبھی اعلیٰ حسب نسب کے ادعا کی صورت میں رونق افروز ہوتی ہے۔ کبھی علم و مرتبے کی بلندی کے پندار میں ظاہر ہوتی ہے تو کبھی معاشرتی تشخص کے غرور اور دولت کی ناگن کے روپ میں آشکار ہوتی ہے۔ بس یہی ہے معاتبت نورِ مصطفویؐ اور نارِ بولہبی کے بیچ جوازل سے تاامروز (باہم) ستیزہ کار ہے اور رہے گی۔

اس لئے اپنے مخصوق تناظر میں اس خیال کے معقول ہونے میں چنداں کلام نہیں کہ ایک درجہ میں انسان اور جن (مؤخرالذکر کو قرآنی اصطلاح میں شیطان سے بھی موسوم کیا جاتا ہے) دو قوتوں کے نام ہیں یعنی خیر اور شر کے۔ وہ اس لئے کہ کوئی انسان جب انسان ہوتے ہوئے بھی بعض اوقات انسان کہلائے جانے کا مستحق نہیں رہتا۔ یعنی جب وہ شرفِ انسانیت کے ارفع مقام سے گر کے تذلل اختیار کر لیتا ہے تو ہم اسے حیوان/ درندہ کہنے لگتے ہیں۔ حالانکہ وہ اپنی ظاہری/طبعی حالتوں کی وجہ سے انسان ہی ہوتا ہے لیکن وقارِ آدمیت کی اہانت اور احترام بشریت کو ٹھکرا دینے ایسے جرائم کی پاداش میں انسان کے عنوان کا حق دار نہیں رہتا۔ اس طرح کوئی قوم غیر مہذب اور غیر متمدن دنیا کے کسی حصہ میں آباد ہے جہاں قرآنی شعور کا نور ابھی نہیں پہنچا۔ علم و تعلیم کا نام و نشان نہیں' حلال و حرام میں کوئی قانونی تمیز نہیں' جدید مادی ترقیات کی برکات اور اعلیٰ نظامِ معاشرت کا کوئی باضابطہ تصور نہیں۔ ایسی دنیا میں اگر ہماری دنیا کا کوئی انسان جا پہنچے اور دیکھے کہ جملہ عمرانی اور قانونی بندشوں سے آزاد ہونے کے باوجود اس غیر تہذیب یافتہ ''سوسائٹی'' میں انسانی عزت اور حرمت کو ایک گونہ تحفظ حاصل ہے تو لامحالہ ان جنگلی لوگوں کو جزوی طور پر ''انسانیت'' کے اس معیار پر انسان ہی قرار دینے پر وہ مجبور ہوگا۔ جس توجیہہ کی بنا پر ہم اپنے اردگرد پھیلے ہوئے لوگوں کو انسان کہتے ہیں۔ اب دوسری طرف دیکھئے! متمرد انسانوں کو اللہ تعالیٰ ان کے ہولناک جرائم کی پاداش میں کیا قرار دیتا ہے۔

قل هل انبئكم بشر من ذٰلك مثوبة عندالله من لعنه الله و غضب عليه و جعل منهم القراد ة و الخنازير و عبدا الطاغوت اولٰئك شرمكانا واضل عن سواء السبيل۔

''ان سے کہو کہ تم ہمارے خلاف ہزار جذبات عناد و عداوت اپنے دل میں رکھو' اس سے ہمارا کچھ نہیں بگڑ سکتا۔ انجام اسی کا خراب ہوتا ہے جو قانون خداوندی کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔ ایسے لوگ زندگی کی

سعادتوں اور خوشگواریوں سے محروم رہ جاتے ہیں۔ان کی انسانی صلاحیتیں جھلس کر راکھ بن جاتی ہیں۔ان سے کہو کہ تم تو خود اپنی تاریخ میں دیکھ چکے ہو کہ احکام سبت کی خلاف ورزی کرنے والوں کا کیا حشر ہوا تھا؟ ان میں انسانیت کا شائبہ تک باقی نہیں رہا تھا۔ان کی سیرت بدترین حیوانوں جیسی ہوگئی تھی۔ان پر ذلت اور محرومی کی مار پڑی۔۔اور محکومی بھی کس کی؟ ان کی جن کی سرکشی اور تمرد کی کوئی حد نہ تھی!

یہ ہیں وہ لوگ جو صحیح راستے سے بہت دور نکل جاتے ہیں اور آخرالامر اس مقام تک جا پہنچتے ہیں جو انسان کے لئے بدترین مقام ہوسکتا ہے''۔(5/60)۔

صاحبو! یہ مترجم کا مخصوص تہذیبی نظام ہے اور ان کی متعین راست نظری ہے کہ وہ اپنے مفہوم کو قرآن کی مجموعی فکر سے مکمل ہم آہنگ رکھنے پر مجبور ہیں اسی لئے ان کے ہاں بھولے سے بھی درشتی اور کھردراپن نہیں آتا ورنہ اصل متن سے Kick حاصل کر کے کوئی 'جلال' میں آنا چاہے تو وہ اپنے غیظ وغضب کا مکمل اظہار کرسکتا ہے۔ مثال کے طور پر اس عہد کے نامی گرامی 'زبان دان' حضرت مولانا ابوالکلام آزاد کا ترجمہ دیکھئے:

''(اے پیغمبر' تم) کہو' کیا میں تمہیں بتلاؤں' اللہ کے حضور جزاء کے اعتبار سے کون زیادہ بدتر ہوا؟ وہ لوگ' جن پر خدا نے لعنت کی' اور اپنا غضب اتارا' اور ان میں سے کتنوں ہی کو بندر اور سؤر کی طرح کر دیا' اور وہ جو شریر قوتوں کو پوجنے لگے۔ یہی لوگ ہیں جو سب سے بدتر درجے میں ہیں اور سب سے زیادہ سیدھی راہ سے بھٹکے ہوئے!''۔

ولقد علمتم الذین اعتدوا منکم فی السبت فقلنا لھم کونو قردۃ خٰسین۔

''پھر تمہیں اپنی قوم کے ان لوگوں کا قصہ تو معلوم ہی ہے جنہوں نے سبت کا قانون توڑا تھا۔ ہم نے انہیں کہہ دیا کہ بندر بن جاؤ اور اس حال میں رہو کہ ہر طرف سے تم پر دھتکار پھٹکار پڑے''۔ (2/65)۔(مترجم: حضرت مولانا مودودی)۔

سنسمہ علی الخرطوم۔

''قریب ہے کہ ہم اس کی سؤر کی سی تھوتھنی پر داغ دیں گے''۔ (68/16)۔ (مترجم: حضرت مولانا احمد رضا بریلوی)۔

اولٰئک کالانعام بل ھم اضل۔

''یہ لوگ چوپایوں کی طرح ہیں بلکہ یہ لوگ زیادہ بے راہ ہیں''۔ (7/170)۔ (مترجم: حضرت

مولانا اشرف علی تھانوی)۔

کانھم حمر مستنفر o فرت من قسورۃ o(74/49-50)۔

''گویا یہ جنگلی گدھے ہیں جو شیر سے ڈر کر بھاگ پڑے ہیں۔'' (مترجم: حضرت مولانا مودودی)۔

ولو شئنا لرفعنہ بھا و لکنہ' اخلد الی الارض و اتبع ھٰوہ فمثلہ کمثل الکلب ان تحمل علیہ یلھث او تترکہ یلھث۔

''اور اگر ہم چاہتے تو بلند کر دیتے اس کا رتبہ ان آیتوں کے باعث لیکن وہ تو جھک گیا پستی کی طرف اور پیروی کرنے لگا اپنی خواہش کی تو اس کی مثال کتے جیسی ہے اگر تو حملہ کرے اس پر تب بھی ہانپے اور اگر تو اسے چھوڑ دے تب بھی ہانپے۔'' (7/176)۔ (مترجم: حضرت پیر محمد کرم شاہ)۔

حضرت اقدس خاتم النبین صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی اپنی امت کے اسافل اور نکوہیدہ علماء (علمائے سوء) کے متعلق احادیث:

علمآ ھم شرمن تحت ادیم السماء

''امت کے علماء آسمان کے نیچے بدترین مخلوق ہوں گے''۔

تکون فی امتی فزعۃ فیصیر الناس الی علماھم فاذاھم قردۃ وخنازیر۔

''میری امت میں ایک زبردست گھبراہٹ پیدا ہوگی۔ یعنی ایسے حالات پیدا ہو جائیں گے جن کو دیکھ کر لوگ گھبرا اٹھیں گے۔ تب وہ لوگ اپنے علماء کی طرف جائیں گے تو ناگاہ انہیں بندر اور سؤر پائیں گے۔''

دوستو! اب فرمایئے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے جو انسانوں کو ان کے غیر انسانی اوصاف و افعال کی وجوہ سے گدھا' بندر' خنزیر' کتا اور چوپایہ وغیرہ قرار دیا ہے تو کیا یہ لوگ ذریت انسانی سے خارج ہو گئے؟ تقریباً سب کا یہی نقطہ نظر ہے کہ ان جانوروں سے اتم ملابست (Similitude) کی بنا پر انہیں کہیں استعارۃً کہیں تشبیہاً جانور قرار دیا ہے۔ لیکن بہرطور اپنے جسمانی خدوخال کی وجہ سے وہ انسان ہی ہیں۔ مگر اپنے قلوب کے ٹیڑھ پن اور عقول کے فقدان کے سبب انسان ہونے کے باوصف یہ لوگ انسان کہلائے جانے کے حق دار نہیں رہے۔۔ تاریخ کے جدلیاتی عمل پر جن کی نگاہ ہے' وہ خوب آگاہ ہیں ہیں کہ Dehumanization کا المیہ ایک مستقل Subject بلکہ ایک باقاعدہ Issue

رہا ہے۔ انسانی ذات کے زوال پر حساس طبائع کڑھتی رہی ہیں۔ سو انذار کے انداز میں اللہ کی وحی نے بھی اس کایا کلپ پر بنی آدم کو بار ہا جھنجوڑا ہے اور انہیں یاد دہانی کروائی ہے کہ تم بہترین مخلوق ہو لیکن کہاں جا گرے ہو؟ احسنِ تقویم کا مقام اسفل السافلین تو نہیں۔

آسمانی کتابوں سے لے کر علمی ادبی لٹریچر (تک) میں اس موضوع پر کیا کچھ نہیں پیش کیا گیا۔ مجاز کے پیرائے میں خواب غفلت میں پڑے انسان کے ضمیر کو بیدار کرنے کے لئے کن کن علامتوں کو نہیں تراشا گیا۔ جو محض Verbalist نہیں بلکہ فہم اور ذکاوت و ذہانت سے کچھ تعلق رکھتے ہیں بس وہی بات کی رمز تک رسائی کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے بلیغ کلام میں مختلف علیہیات کی بنا پر انسانوں کو دو بڑے عمومی گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ان کی خصوصیات کو ممیّز کرنے کے لئے انہیں الگ الگ نام دے دیئے۔ ایسے لوگ جو تہذیب' تمدن' قوانین فطرت سے ہم آہنگ' اذغان و اطاعت گزار' نرم خو اور صلح جو ہیں' انہیں انسان کہا اور اس کے برعکس لاقانونیت اور بے اصولی و بے ضابطگی پر مبنی صحرائی' بیابانی اور خانہ بدوشوں کی سی زیست بتانے والوں کو ''جن'' کہا گیا ہے۔ کیونکہ ایسے لوگوں میں ناری صفات اور جنگ جویانہ کیفیات بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں لیکن اپنی ظاہری جسمانی حالتوں کی وجہ سے دونوں بہرطور انسان ہی ہیں۔ مگر دونوں کی طبائع میں واضح فرق ہے۔

اس لئے یہ جو فرمایا ہے کہ ہم نے انسانوں سے پہلے جنوں کو بنایا تو اس کے وہ معانی اپنی جگہ کہ مٹی کی مخلوق سے قبل آگ کی مخلوق بنائی گئی لیکن ایک دوسرے معانی بھی لئے جا سکتے ہیں کہ یہاں مشاراً الیہ انسانوں کی غیر مہذب وہ اقوام ہیں جن کی بابت فرشتوں نے کہا تھا:

اتجعل فیھا من یفسدوا فیھا و یسفک الدماء۔

''کیا تو ان میں ایسے شخص بھی پیدا کرے گا جو اس میں فساد کریں گے اور خون بہائیں گے؟''۔ (2/30)۔

مطلب یہ کہ آپ آگے چل کر زمین کی امامت ایسے خونریزوں کے سپرد کیوں کرنا چاہتے ہیں؟ لیکن خدا نے کہا:

انی اعلم مالا تعملون۔

''میں یقیناً وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے''۔ (2/30)۔

اب ایسے لوگ واقعتاً قرآنی اسلوب کے مطابق جنات ہی تھے کیونکہ وہ نورِ وحی اور تابانیٔ نبوت سے کوسوں دور تھے اور قوانینِ خداوندی کی راہنمائی میں معاشرت کا ابتدائی تصور بھی ان کے ہاں متعارف نہیں

تھا۔ اس لئے تو فرشتوں نے ان کی مفسدانہ کارروائیوں سے بھری زندگی کی جھلک دیکھ کر اس موعود اعزاز پر اعتراض کیا تھا۔ لہٰذا خدا تعالیٰ نے بعد از نورِ نبوت اور قبل از عطائے نبوت کے انسانوں میں تخصیص کر دی یعنی پہلوں کو جن اور بعد والوں کو انسان قرار دیا۔ واضح رہے کہ یہاں تخلیقِ آدم سے مراد پہلے آدمی کی Creation نہیں بلکہ آدمیوں میں سے چیدہ آدمی کو رسالت کے منصب سے معزز کیا جانا ہے۔ خدا کے ہاں چونکہ رسالت و نبوت سے بڑا انعام انسان کے لئے اور کوئی نہیں اسی لئے ملائکہ متعجب ہو کر معترض ہوئے تھے کہ سب سے بڑی نعمت انہیں دے رہے ہیں جو باہم دست و گریباں رہتے ہیں؟

اچھا آدم اور ابلیس کے بیچ جو خطِ امتیاز کھینچ دیا گیا ہے وہ تاریخ میں مسلسل دکھائی دیتا ہے کہیں موسیٰؑ کی مقاومت میں فرعون تو کہیں ابراہیمؑ کے مقابل نمرود اور کہیں محمد ﷺ کے دو بدو ابولہب۔

اگر جنات کے باب میں قرآن کے انداز و اسلوب کو استعاراتی / مجازی معنوں کی بجائے حقیقی معانی کا لبادہ اوڑھانے کی کوشش کی گئی تو تناقض و تعارض کا نقشِ سویدا ابھرے گا یا پھر مسبوق الذکر آیات کو بھی ظاہری الفاظ پر محمول کرنا پڑے گا جن میں انسان کو غیر انسان قرار دیا گیا ہے۔ الانعام کہا گیا ہے۔ یعنی انسانوں کو فی الواقعہ Quadruped تسلیم کرنا پڑے گا۔ چار پاؤں، ایک دم اور حسبِ ضرورت دو سینگوں والا باقاعدہ حیوان۔

ہاں اس خالص تکنیکی اعتراض میں بظاہر جان دکھائی دیتی ہے کہ انسان (مشبہ) کو اگر اس کی بعض منفی خصوصیات کی بنیاد پر (اسے) کسی جانور سے تشبیہہ دی گئی ہے تو مشبہ بہہ یعنی وہ حیوان تو موجود ہے۔ جب انسان کو جن قرار دیا گیا ہے تو اس کا مطلب واضح ہے کہ جنات بہرحال انسان سے ہٹ کر کوئی مخلوق ضرور ہوں گے۔

اس عقلی نکتے کا بڑا سادہ جواب یہ ہے کہ جب خود خدا نے کہا ہے کہ انسانوں سے قبل ہم نے ایک ناری مخلوق تخلیق کی تھی (انسان جس کا جانشین ہے) تو ثابت ہو گیا کہ مشبہ بہہ یا مستعار منہ، کا اس کائنات میں کبھی وجود تھا۔ لیکن اب وہ مخلوق چونکہ موجود نہیں ہے لہٰذا اس قدیمی مخلوق کی بعض صفات کو وجہ شبہ یا وجہ جامع کی بنا پر مستعار لے کے اللہ نے ہی انہیں مشبہ یا مستعار لہٗ (یعنی انسان پر) منطبق کیا ہے۔

آگے چلئے یہ آیت مزید تصریح کر دے گی۔

و اذا خلو الیٰ شیطینھم قالوآ انا معکم۔

''اور جب وہ شیطانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم یقیناً تمہارے ساتھ ہیں۔'' (2/14)۔

(اس آیت کے حوالے سے) ہماری نظر سے آج تک ایک بھی مترجمہ قرآن ایسا نہیں گزرا جس میں شیٰطین کا مفہوم ''اصلی تے وڈے شیطان'' بیان کیا گیا ہو۔ سب نے بالاتفاق یہی موقف اختیار کیا ہے کہ یہاں شیٰطین سے مراد دشمنوں کے سرغنہ ہیں' متغنی سردارانِ کفار۔ سوال صحیح اٹھایا گیا ہے کہ اگر انسانوں کو ان کے بعض خصائص و شمائل کی وجہ سے ''شیاطین'' قرار دیا جا سکتا ہے تو ان کے مخصوص اوصاف کی بنا پر انہیں ''جنات'' کیوں نہیں کہا جا سکتا؟

آیئے قرآن مجید کی ایک اور آیت سے راہنمائی حاصل کرتے ہیں۔

وکذٰلک جعلنا لکل نبی عدوا شیٰطین الانس والجن یوحی بعضھم الی بعض زخرف القول غرورا۔ (انعام 112)۔

''اور یہ بات کچھ نئی نہیں۔ جو نبی بھی آیا' اس کی قوم کے بڑے بڑے سرغنے' خواہ وہ شہروں میں بسنے والے متمدن افراد تھے یا باہر بدویت کی زندگی بسر کرنے والے غیر مہذب۔ اس کی مخالفت کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ (اس لئے کہ اس دعوتِ انقلاب کی ان کی مفاد پرستیوں پر زد پڑتی تھی)۔ اس کے لئے وہ باہمی خفیہ سازشیں کرتے اور عوام کو اپنے ساتھ رکھنے کے لئے ان سے طرح طرح کی ملمع سازی کی باتیں کرتے (اس لئے اے رسولؐ! تم ان کی اس روش سے کبیدہ خاطر نہ ہو)۔ اگر مقصود یہ ہوتا کہ دعوتِ آسمانی کی کہیں سے مخالفت ہی نہ ہو اور سب لوگ اسے طوعاً و کرہاً مانتے چلے جائیں تو ہم اپنے قانونِ مشیت کے مطابق ایسا بھی کر سکتے تھے۔ لیکن یہ ہمارے پروگرام کے خلاف ہوتا جس کی رو سے ہم نے انسان کو صاحب اختیار و ارادہ بنایا ہے۔ اس لئے تم ان سے اور ان کی فریب کاریوں سے صرف نظر کرتے ہوئے' انہیں ان کے حال پر چھوڑ دو (اور اپنے پروگرام کی تکمیل میں سرگرمِ عمل رہو)۔ (6/112)۔

مذکورہ آیت کریمہ میں بڑی ہی منفرد اصطلاح 'شیٰطین الانس' لائق غور ہے جس نے ہر قسم کے ریب اور التباس کو جڑ سے اکھیڑ کر رکھ دیا ہے۔ یہ فرما کر کہ بعض انسان حضرات' شیطان بھی ہوا کرتے ہیں۔ یوں تو نرا شیطان بھی کہا ہوتا تو مفہوم اس صورت میں بھی واضح ہوتا (جیسا کہ کئی مقامات پر انسانوں کو براہ راست شیطان کہا گیا ہے)۔ لیکن ''شیٰطین الانس'' نے تو معاملہ بالکل ہی صاف کر دیا ہے۔ اب یہ شیاطین الانس (قائدین کفار) اپنی ظاہری ہیئتوں اور طبعی حالتوں کی وجہ سے بے شک

پورے پورے انسان ہی ہوتے ہیں لیکن اپنے ذہن کے منفی رجحانات اور طاغوتی طرزِ فکر کے سبب شیطان اور عزازیل کہلائے جانے کے مستحق ہوتے ہیں۔

اوپر جس مفہوم کو ہم نے نقل کیا ہے اس میں ''شیٰطین الانس والجن'' کی ترجمانی کا حق ان الفاظ نے ادا کر دیا ہے؟ ''قوم کے بڑے بڑے سرغنے خواہ وہ شہروں میں بسنے والے متمدن افراد تھے یا باہر بدویت کی زندگی بسر کرنے والے غیر مہذب۔۔۔''۔

قرآن کی پہلوداریوں پر جھوم اٹھنے کو جی چاہتا ہے کہ دنیا میں ابتدا سے یہی دستور رہا ہے۔ خواہ شہروں میں مقیم عیار دانشور ہوں یا سادہ لوح اکھڑ صحرانشین ہوں وقت کے نبی کی معاندت میں سب یک جان اور متفق اللسان ہو جاتے ہیں۔ عجیب مقام ہے یہاں جاہل و عالم کا تفرقہ' یکبارگی اٹھ جاتا ہے۔ رنگ و نسل کی دوئی ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔ آپ ماضی پر نظر ڈال کر دیکھئے' کیا یہودیوں اور عیسائیوں میں کوئی قدر مشترک ہے؟ ایک دوجے کی جان کے بیری' ایک دوجے کی خون کے پیاسے لیکن میرے محمد عربی ﷺ کی عداوت میں کس طرح عہد موجود تک باہم شیر و شکر ہیں۔

ے ہے یوں تو میرے رقیبوں میں اختلاف بہت
مِرے خلاف مگر اتحاد کتنا ہے!!!!!!!

سو ''انسانوں'' کا کیا شکوہ کریں اور جنات'' کو کیا برا بھلا کہیں؟ سب ایک دوسرے کے بھائی بند ہیں۔ سعید الفطرت تو دونوں گروہوں میں چند ایک ہی برآمد ہوتے ہیں۔ [1]

[1] مفروضہ جنات سے ہر خوفزدہ شخص قرآن مجید کی آخری سورت کی آخری آیت کو بطور حوالہ ہمیشہ Quote کرتا ہے۔

من الجنة والناس o. خواہ وہ جنات میں سے ہو یا انسانوں سے۔

حالانکہ اسی آیت کے سیاق و سباق پر غور کر لیا جائے تو ساری صورتحال واضح ہو جاتی ہے کہ اصل قضیہ تو وسوسہ اندازی کے مکروہ عمل سے جڑا ہوا ہے۔

یعنی تاکید کی گئی ہے کہ لوگوں کے وسوسوں کے شرور سے بچنا چاہتے ہو تو اللہ (کے قانونِ حفاظت) کی پناہ میں آ جاؤ۔ پھر نشاندہی بھی کر دی ہے کہ قلوب میں وسوسہ ڈالنے والے مفسد دونوں گروہوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ انسانوں کے گروہ سے بھی اور جنات کے ٹولے سے بھی۔

مراد یہ ہے کہ

''یہ کچھ جانے پہچانے لوگوں کی طرف سے بھی ہوتا ہے اور ایسے لوگوں کی طرف سے بھی جو اجنبی اور بیگانے ہوتے ہیں۔ نیز ایسی مخفی قوتوں (غیر محسوس پراپیگنڈے کے نفسیاتی اثرات) کے ذریعے بھی جو بظاہر نظر نہیں آتیں۔ (اس نئی منزل میں داخل ہوتے وقت ان تمام تخریبی قوتوں کی شرانگیزیوں سے محتاط رہنا ہوگا۔ یہ احتیاط اسی صورت ہو سکتی ہے کہ تم زیادہ سے زیادہ قوانین خداوندی کی اطاعت کرو)۔'' (114/6)۔

اب یہ کہنا کہ جنات کے الگ مخلوق ہونے کی دلیل یہ ہے کہ وہ دلوں میں وسوسہ اندازی کی تخریبی کارروائی چھپ چھپا کر کرتے ہیں۔ بجا ارشاد ہے۔ اگر اسے یوں کہہ لیا جائے تو کیا زیادہ بہتر نہیں کہ وہ عیار افراد جو شرارت اور فساد کے فروغ کی خاطر لوگوں کے قلوب میں وساوس پیدا کرنے کی ناپاک مہم کو اپنا مقصد حیات قرار دے لیتے ہیں۔ قابل مذمت ہیں' ان سے بچ کر رہنا چاہئے۔ جو یہ مذموم کام اعلانیہ کرتے ہیں یعنی کھلے بندوں فتنہ پھیلاتے ہیں وہ انس ہیں جو مہا چالاکی کے ساتھ پس پردہ رہ کر یہ خباثت کرتے ہیں وہ جن ہیں۔ اور دونوں موذیوں سے محفوظ رہنے کی یکساں ضرورت ہے۔

ایک اور طرف بھی قابلِ تفحص ہے کہ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم میں شیطانِ رجیم سے مراد 'ابلیس' لیا

جاتا ہے۔ قرآن نے ابلیس کو جن قرار دیا ہے (18/50)۔ نیز سورۃ البقرہ، سورۃ الکہف، سورۃ طٰہٰ، سورۃ الاعراف میں بار بار کہا ہے۔

و اذ قلنا للملٰئکۃ اسجدو الادم فسجدو الا ابلیس۔

یعنی آدم کی اطاعت نہ کرنے، حکم الٰہی کو ٹالنے والی شخصیت ابلیس کے اسم سے معروف ہوئی ہے۔ پھر استکبار کرنے والے اسی ابلیس کے آتشیں پیکر کو ان آیات کے سیاق وسباق میں متعدد جگہ شیطان قرار دیا ہے۔ مثلاً

۱۔ فازلھما الشیطٰن عنھا، (البقرہ۳۶)۔
۲۔ فوسوس الیہ الشیطٰن، (طٰہٰ۱۲۰)۔
۳۔ فوسوس لھما الشیطٰن، (الاعراف۲۰)۔
۴۔ ان الشیطٰن لکما عدو مبین، (الاعراف۲۲)۔

کم از کم یہ تو طے ہوا کہ اللہ نے جن کو شیطان بھی کہا ہے۔ ابلیس کے متعلق پہلے ہی ثابت ہے کہ وہ جنوں میں سے تھا۔ گویا ابلیس جن بھی ہے اور شیطان بھی۔ باقی انسان کو شیطان قرار دیا جانا بھی جگہ جگہ مذکور ہے۔ خلاصہ تو اتنا ہے کہ وہی انسان اپنی شیطنت کی بنا پر کہیں ابلیس نام پاتا ہے تو کہیں جن۔

یہ Equation یوں بھی Prove ہوتی ہے۔

| | | |
|---|---|---|
| ابلیس | = | شیطان |
| شیطان | = | جن |
| انسان | = | شیطان |
| جن | = | انسان |

---

اب آیئے آخر میں سب سے اہم سوال کی جانب جو ہماری دانست میں 'قول فیصل' کا درجہ رکھتا ہے۔ از روئے قرآن یہ بتایا جائے کہ خدا نے حضورﷺ کو کس مخلوق یا نسل کی ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا تھا؟ آپﷺ کے رحمۃ اللعالمین، ہونے کے کیا یہ معانی ہیں کہ آپؐ تمام Species کی طرف بھیجے گئے تھے؟ یا صرف نوعِ انسان کے کردار کی تعمیر کے لئے آپﷺ کو رب کریم نے مقرر کیا تھا؟ قرآنی بدیہیات سے ہمیں علم ہوتا ہے کہ آپؐ کی بعثت صرف انسانوں کی طرف ہوئی تھی۔

وارسلنک للناس رسولا و کفی باللہ شہیدا

''(لیکن چونکہ) یہ تمام نوعِ انسان کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔۔۔ یہ وہ حقیقت ہے جس پر خود خدا شاہد ہے''۔(4/79)۔

قرآن مجید کی اس نیر وتاباں آیت میں خالق اعصار و دہور نے بالبداہت و بالصراحت یہ اصولی بات

بیان کردی ہے کہ نبی اکرم ﷺ صرف انسانوں کی اصلاح کے لئے تشریف لائے تھے۔ غیر از انسانوں کی جانب قطعاً نہیں۔ اب کون نہیں جانتا کہ 'للناس' میں بندے بشر ہی شامل ہیں۔ کوے' کبوتر' طوطے' فاختائیں' مینائیں' ہُدہُد' بکریاں' شیر اور ہاتھی تو شامل نہیں ہیں۔ اسی طرح جمادات و نباتات بھی Independent مخلوقات ہونے کے باوصف نسل انسانی میں شریک نہیں سمجھی جاتیں۔ ہم نے کسی سے نہیں سنا کہ چرند پرند' چیونٹیوں' پروانوں' جگنوؤں اور کیڑوں وغیرہ سے یوم الحساب کو پوچھا جائے گا کہ آؤ اور وضاحت کرو تم اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان کیوں نہیں لائے تھے؟ نہ کسی آیت میں یہ ثواب و عذاب کے مکلّف قرار دیئے گئے ہیں۔ مختصر یہ کہ خدائے بزرگ و برتر نے آپ ﷺ کو بجز انسانوں کے کسی اور مخلوق کی طرف مبعوث ہی نہیں کیا۔ اب دیکھیں یہ آیت کس بلیغ انداز میں اس آیت کو حل کرتی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ آپ ﷺ کی ذات منافع مستمرہ پر جن ایمان لے کے آئے تھے۔ مطلب بڑا واضح ہے کہ وہ ''جنات'' بھی انسان ہی تھے۔ 'للناس' میں شامل تھے۔ کتنی منطقی بات ہے کہ اگر جن کو نوعِ انسانی سے خارج خیال کیا جائے گا تو پھر اس پر کوئی پابندی نہیں کہ وہ آپ ﷺ کی اطاعت کرے۔ مراد یہ کہ خداوند عزوجل نے ایک خاص تناظر میں انسانوں کے دو گروہوں کو آپس میں منفصل کرنے کے لئے ان کی امتیازی اور مختلف خصوصیات کی وجہ سے الگ الگ اسلوب میں مخاطب کیا ہے۔ الگ الگ ناموں سے موسوم کیا ہے۔ ایک عظیم مفکر قرآن کے لفظوں میں' ایک کو عرب کی متمدن یعنی شہری آبادی کہہ لیجئے' دوسرے کو بدوی باشندے سے پکار لیجئے۔

شہری اور دیہاتی آبادی کو مخصوص محاورے میں انس اور جن کا خطاب دینے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ عموماً (خاص طور پر اس زمانے میں) دیہی آبادی پس منظر میں ہوتی ہے اور حضری آبادی پیش منظر میں۔ چونکہ اول الذکر کے اندازِ معاشرت اور رہنے سہنے میں ایک گونہ اخفا' استتار اور پنہانی کا پہلو موجود ہوتا ہے۔ اس لئے بھی انہیں جن کہا گیا ہے کیونکہ ماہرین لغت کا کہنا ہے کہ جن کے لغوی معنی ہیں چھپی ہوئی' مستور' نگاہوں سے اوجھل' ''غیر مرئی''۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# قومی غیرت کوئی چیز تو ہوتی ہوگی؟

محترم جمیل الدین عالی صاحب 2 لاکھ بہاریوں کی واپسی کے لئے جنگ مورخہ 8 اگست 2005ء میں لکھتے ہیں۔

''محصورین سے متعلق انجمن کے سرگرم کارکن برادرم انجینئر احسان الحق نے کراچی آ کر کارکنوں کی ایک مختصر سی مجلس منعقد کی مجھے بھی یاد کیا کہ میں برسوں سے محصورین کی واپسی کے حق میں لکھتا ہوں ہم نے طے تو یہی کیا کہ جب تک وہاں محصورین یہ مسئلہ زندہ رکھیں گے ہمیں بھی اسے تازہ رکھنا ہوگا لیکن ہمیں کسی نہایت ہی پاورفل گروپ کی فعال حمایت چاہئے''۔

اس مسئلہ پر قومی بے حسی کا تذکرہ یوں کرتے ہیں۔

''کیا کہوں کچھ لکھا نہیں جاتا
بن لکھے بھی رہا نہیں جاتا

ہم کیسی قوم' کیسا معاشرہ' کیسی حکومت ہیں کہ اپنے سچے پاکستانیوں کو ''بہاریوں'' کہہ کر ٹال رکھا ہے اور تمام وکمال بے غیرتی کے ساتھ ان کا مسئلہ فراموش کئے بیٹھے ہیں''۔

''فاک لینڈ'' میں دو اڑھائی ہزار انگریزوں کے لئے برطانیہ نے فوج اتار دی تھی کیونکہ یہ ان کی قومی غیرت کا سوال تھا۔ جمیل الدین عالی صاحب ہماری غیرشا کی چنگاری کو پھونک مار کر کہتے ہیں۔

''خدارا اگر قومی غیرت کوئی چیز ہوتی ہے تو محصورین پاکستان کا بنگلہ دیش میں یوں بھوکا ننگا بے یارومددگار پڑے رہنا اور اپنے آپ کو پاکستانی کہے جانا ہماری قومی غیرت کا سوال نہیں ہے؟ اے تاریخ اے مستقبل ابھی اپنی رفتار ہلکی رکھنا شاید کوئی اہل دل گروپ کوئی خدا کا بندہ جلد پیدا ہو اور ہمارے محصورین کو پاکستان لے آئے۔ ورنہ نہ جانے تیرے ریکارڈ میں ہمارا یہ دور کس طرح یاد کیا جائے گا''

میں چاروں صوبوں کے تمن داروں' ذیلداروں' نمبرداروں' جاگیرداروں' بڑے باغبانوں مربعہ داروں' اہل ثروت اور ہر پاکستانی سے اپیل کرتا ہوں کہ آیئے! ہم سب مل کر بہاریوں کو چاروں صوبوں میں خوش آمدید کہیں! اور قیام پاکستان کے لئے ان کے بزرگوں کی کوشش کی لاج رکھ لیں اور آج مورخہ 14 اگست 2005ء ان کو یوم آزادی کی مبارک باد دیں۔

ملک حنیف وجدانی۔ صدر باغبان ایسوسی ایشن۔ سنبل سیداں۔ نیومری۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دستک

ڈاکٹر شبیر احمد۔ ایم۔ ڈی (فلوریڈا)

# پے گن کون؟

پتھرو آج مرے سر پہ برستے کیوں ہو؟
میں نے تم کو بھی کبھی اپنا خدا رکھا ہے

بوجھئے تو جانیں کہ دنیا میں سب سے بڑا مذہب کون سا ہے؟ مسیحیت؟ اسلام؟ کچھ اور؟ صحیح جواب ہے کچھ اور۔ جسے انگریزی میں پے گن Pagan کہتے ہیں۔ یہ لفظ ایسا ہے کہ اس کا ترجمہ کیجئے تو طعنہ بن جاتا ہے۔ مشرک، بت پرست، نیچر کو پوجنے والے۔ خدا کا انکار کرنے والے۔ وغیرہ وغیرہ! مسلمان ناراض ہوتے ہیں تو مسیحیوں کو پے گن کہہ دیتے ہیں اور مسیحی ناراض ہوتے ہیں تو مسلمانوں کو پے گن کہہ دیتے ہیں لیکن اصلی پے گن وہ ہوتا ہے جو پے گن کہلانے پر برا نہیں مانتا۔

صاحبو! گزشتہ دنوں امریکہ کے سب سے بڑے پے گن لیڈر رہنری کرافورڈ سے ملاقات ہوئی۔ اب سنئے ان کے ارشادات بقلم شبیر۔

پے گن کون ہوتا ہے؟ وہ شخص پے گن ہوتا ہے جو ایمان رکھے کہ ہر چیز میں روح موجود ہوتی ہے۔ دریا، جانور، پتھر، چٹانیں، درخت، زمین۔ سب کی جداگانہ روحیں ہوتی ہیں۔ پے گنز کی نظر میں ہر شے ایک بلند و بالا ہستی کی روح ضرور رکھتی ہے۔

کیا پے گن مذہب کی کوئی قسمیں ہیں؟ جی ہاں! سینکڑوں قسمیں ہیں جن میں مشہور ترین بدھ مت، ہندومت، شنٹو اور تاؤ شامل ہیں۔ ریڈ انڈین باشندے اور جین مت کے ماننے والے بھی اسی زمرے میں آتے ہیں۔ مومن خان مومن کا شعر یاد آیا۔ کیونکہ یہ سب اپنے پے گن ہونے پر مطمئن ہیں۔

عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومنؔ
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہونگے

کیا پے گنزم Paganism کوئی کلٹ Cult یا کسی مذہب کی بگڑی ہوئی شکل ہوتی ہے؟ جی نہیں۔ یہ اس وقت دنیا کا سب سے بڑا مذہب ہے۔ عام طور پر سفید فام

لوگ کسی خطے کے غیر سفید فام لوگوں کے مذہب کو کلٹ کہہ دیتے ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ مسیحیت کے بعض گروپ عجیب عقیدے اپنا کر کلٹ بن جاتے ہیں جیسے ٹیکساس والا ڈیوڈ کریش تھا یا جم جونس۔

کیا پے گن شیطان کی پوجا کرتے ہیں؟ جی نہیں وہ شیطان میں یقین ہی نہیں کرتے۔ شیطان کے پجاری عموماً مسیحیت کے ٹوٹے ہوئے ستارے ہوتے ہیں۔

کیا پے گن لوگوں میں چڑیلیں اور جادوگرنیاں Witches ہوتی ہیں؟ ان میں بعض گروپ ایسے ہیں جن میں کرسچنز کی طرح جادوگری اور وچز میں یقین رکھا جاتا ہے۔

کوئی پے گن ہونا چاہے تو کیا کرے؟ وہ نیچر سے محبت کرے اور تہیہ کرے کہ زمین اور اس پر جتنی مخلوق موجود ہے ان کے ساتھ متوازن زندگی بسر کرے گا۔

پے گن رسوم ورواج کیا ہوتے ہیں؟ انسانوں نے ہمیشہ سے رسوم و رواج اپنائے ہیں۔ پے گن اپنی رسمیں اکیلے اکیلے بھی مناتے ہیں اور مل کر بھی۔ مثلاً دادی ماں بیرونی دروازے پر گھوڑے کی نعل رکھ کر سمجھتی ہے کہ اس نے گھر کے مکینوں کو محفوظ کر لیا ہے۔ اپنے دائیں کندھے پر نمک چھڑک لیجئے۔ سمجھئے کہ بدقسمتی آپ کو چھو کر نہ گزرے گی۔ ہم نے جناب کرافرڈ کو ترجمہ کر کے یہ شعر سنایا تو انہیں بالکل برا نہ لگا بلکہ بہت خوش ہوئے۔ ؎

بتوں سے تجھ کو امیدیں خدا سے نومیدی
مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے؟

کہنے لگے کافری ہی تو اصل مذہب ہے۔ اجتماعی رسموں میں پے گن لوگ زمین کی چاروں سمتوں کی طرف منہ کر کے جھکتے ہیں۔ آج بھی وہ ہوا پانی آگ اور مٹی کو بنیادی عناصر سمجھتے ہیں۔ ایک بڑا سا دائرہ بنا کر اس میں چھڑکاؤ کرتے ہیں۔ آگ کا الاؤ روشن کیا جاتا ہے اور تھوڑی سی خاک اڑائی جاتی ہے۔ پھر گانے اور رقص ڈھول باجے اتنی دیر تک چلتے ہیں کہ سب تھک کر بے حال ہو جائیں۔

سوال۔ کرافورڈ صاحب مخلوق کے ساتھ متوازن یا ہم آہنگی کی زندگی بسر کرنے سے آپ کی کیا مراد ہے؟

جواب۔ ہمیں سمجھنا چاہئے کہ حیوانات نباتات اور جمادات سب میں ہماری ہی طرح ایک عظیم ہستی کی روح موجود ہے۔ جس نے ہمیں بنایا اسی نے انہیں بنایا۔ جس طرح ہماری آرزوئیں اور امنگیں ہوتی ہیں۔ دکھ درد ہوتے ہیں اسی طرح ہر مخلوق کے ہوتے ہیں۔ انسان کو خوش فہمی ہے کہ وہ زیادہ ذہین ہے لہٰذا نیچر پر حکومت کر سکتا ہے۔ اس حکومت کی قیمت جو وہ چکاتا ہے اس کا اندازہ تک نہیں کر سکتا۔ یہ انسان ہے جو ایک دوسرے کو گمراہ کہتا رہتا ہے۔ کیڑا مکوڑا کسی درخت کو یا درخت کسی پہاڑ کو گمراہ یا بھٹکا ہوا نہیں کہتا۔ مختصراً یوں سمجھ لیجئے کہ ہمیں ہر مخلوق سے محبت کے ساتھ پیش آنا چاہئے۔

سوال۔ اس طرح آپ وحدت الوجود یا ہمہ اوست کے قائل ہوئے؟

جواب۔ بے شک ہر چیز میں وہی ہستی جلوہ فرما ہے۔ مسلمانوں کے صوفی، ہندوؤں کے جوگی اور مسیحیوں کے Mystic یہی بات تو کہتے ہیں۔ پھر وہ پے گن نہیں تو کیا ہیں؟ بلکہ مسیحیت تو بہت ہی زیادہ پے گن ہے کیونکہ وہ مسیح کو خدا کا اوتار سمجھتے ہیں۔

سوال۔ لیکن مسیحی تو آپ کو پے گن کہتے ہیں۔

جواب۔ جناب تین خداؤں کو مانئے یا تین کروڑ کو بات تو ایک ہی ہے ہمارے نزدیک وہ پے گن ہیں ان کے نزدیک ہم۔ پھر جھگڑا کیا؟

سوال۔ کیا پے گن پیغمبروں میں یقین رکھتے ہیں؟

جواب۔ صرف ان معنوں میں کہ وہ ایسے لوگ تھے جنہوں نے مخلوق سے یا ماحولیات کو محبت کا درس دیا۔

سوال۔ کیا پے گن ایک خدا یعنی توحید پر یقین رکھتے ہیں؟

جواب۔ جی نہیں بہت سے مذکر اور مؤنث خداؤں پر ہمارا ایمان ہے۔ انہیں آپ دیوتا یا دیویاں کہہ لیجئے۔ اصل میں جو کچھ ہے وہ ان ہی دیوی دیوتاؤں کا جلوہ ہے جو کچھ ہمیں نظر آتا ہے وہ واہمہ ہے۔ اس موقع پر ہمیں علامہ اقبالؔ کا شعر یاد آیا۔ ؎

حق بات کو لیکن میں چھپا کر نہیں رکھتا
تو ہے تجھے جو کچھ نظر آتا ہے نہیں ہے

سوال۔ کیا پے گن عبادت کرتے ہیں؟

جواب۔ جی ہاں! دیوی دیوتاؤں کے آگے سر جھکاتے ہیں، چڑھاوے دیتے ہیں۔ گانا، ڈرم بجانا، رقص کرنا، دیویوں کو خوش رکھتا ہے۔ کسی درخت یا چٹان کی طرف رخ کر کے گہری سوچ میں ڈوب جانا بھی عبادت ہے۔ ساحل سمندر سے کوڑا کرکٹ اٹھانا بھی پوجا پاٹ ہے۔

سوال۔ پے گنز اور کیا کرتے ہیں؟

جواب۔ بس نیچر کو خدا مانتے ہوئے اور ہر چیز میں روح کی موجودگی تسلیم کرتے ہوئے دیگر لوگوں کی طرح ہی جیتے ہیں۔ ہمارے ہزار ہا عبادت خانے دنیا میں ہیں لیکن ہماری پوجا پاٹ کھلے میدانوں جنگلوں، پارکوں، جھیلوں اور سمندری ساحلوں پر اور کھلی فضا میں بھی ہو جاتی ہے۔

سوال۔ لوگ پے گنز کو برا کیوں سمجھتے ہیں؟

جواب۔ خصوصاً اس لئے کہ ہم ان کے مذہب میں شامل نہیں ہوتے۔ ادھر ہالی ووڈ کی فلموں نے ہمیشہ ہمارے ساتھ ناانصافی برتی ہے۔ سچائی یہ ہے کہ دنیا کے ہر مذہب کے پرستاروں میں آپ کو اکثریت مشرکین کی ملے گی۔ وہ بتوں کی نہیں تو انسانوں کی اور قبروں کی پوجا کرتے ہیں۔ ؎

تیرے بھی صنم خانے میرے بھی صنم خانے
دنوں کے صنم خاکی دونوں کے صنم فانی

سوال۔ پے گن بننے کے لئے کیا کرنا ہوتا ہے؟

جواب۔ بس نیچر سے اور فطرت کے مظاہر سے محبت کیجئے۔ سیارۂ ارضی اور اس کی مخلوق کا خیال رکھئے۔ ماحول کو آلودگی سے بچائیے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ پے گن ہونے کا رجحان پیدائشی ہوتا ہے۔ آپ کا دل خود پکارتا ہے کہ میں پے گن ہوں۔ مشرک یا پولی تھیسٹ' دہریہ یا کافر سب نفرت کے الفاظ ہیں۔ حالانکہ یہ سب ہمارے ہی بھائی بند ہوتے ہیں۔ چودھویں کا چاند چمک رہا ہو۔ اس پر نظریں جما کر اپنے آپ سے آہستہ آہستہ باتیں کیجئے' پھر گنگنائیے۔ ڈھلے ہوئے الفاظ خود بخود اترتے آئیں گے اور آپ حیران ہو جائیں گے کہ آپ کتنی آسانی سے خوبصورت جملے یا ہلکے پھلکے شعر کہہ لیتے ہیں۔ پودوں کو یا اپنی بلی کو خاموشی سے دیکھئے آپ ایک توانائی محسوس کریں گے۔ آپ کے اردگرد کی دنیا جادو بھری دنیا ہے۔ اس انرجی کو اپنی ذات کا حصہ بنا لیجئے۔

سوال۔ مسٹر کرافورڈ آپ دیگر لوگوں سے مختلف تو نظر نہیں آتے۔

جواب۔ ہمیں مختلف نظر آنا بھی نہیں چاہئے۔ ہم قدرت کے طور طریقوں کے ساتھ چلتے ہیں۔ زمین کو زندگی بخش دھرتی ماتا سمجھتے ہیں اور بچوں کو بھی یہی سبق دیتے ہیں۔ ہم سکول جاتے ہیں۔ کام کرتے ہیں۔ ٹیکس دیتے ہیں۔ گھروں کو صاف ستھرا رکھتے ہیں۔ باغبانی سے شغف رکھتے ہیں اوروں کی طرح ہم بھی کمپیوٹرز کو پسند یا ناپسند کرتے ہیں۔ ہر جاندار چیز کی عزت کرتے ہیں اور اپنے دیوی دیوتاؤں سے اسی طرح عقیدت رکھتے ہیں جیسے اور مذاہب والے اپنے خداؤں سے۔

سوال۔ کیا ایک مسیحی یا مسلمان پے گن ہوسکتا ہے؟

جواب۔ بالکل ہوسکتا ہے اور ہوتا ہے۔ مسیحیوں نے بہت سے پے گن عقیدے اپنا رکھے ہیں۔ آئرش' میکسیکن اور ساؤتھ امریکن' کیتھولک ہمارے بہت سے عقیدے اور رسوم و رواج اپنائے ہوئے ہیں۔ یہ جو مے ڈے May Day ہوتا ہے اس میں ''میری'' Mary کی تاجپوشی کی جاتی ہے۔ یہ رواج انہوں نے ہم سے ہی لیا ہے۔ مئی کے مہینے کی ملکہ تو ہماری دیوی ہے۔ وحدت الوجود والے مسلمان تو ہوتے ہی پے گن ہیں۔

سوال۔ اب اپنے عقیدے پر قائم رہنے کے کچھ اصول بتائیے۔

جواب۔ بہت سادا سا اصول ہے۔ نیچر کا احترام کیجئے اور اس کے طور طریقے سیکھئے۔ کتابیں پڑھئے نہ پڑھئے لیکن صرف گھاس پر ہی دس منٹ توجہ کیجئے۔ رات کا آسمان' چاند اور اس کے مدارج' پھول پتے' جڑی بوٹیاں' ہوائیں' فضائیں سب آپ کو دعوت نظارہ دیتی ہیں۔ عجائب گھروں میں قدیم دیوی دیوتاؤں کے مجسمے دیکھئے' ریڈ انڈین بستی میں جا کر ان کی بود و باش کا جائزہ لیجئے۔ روزانہ چند منٹ کے لئے خالی الذہن ہو جائیے۔

قدرتی مناظر کی تصاویر جمع کیجئے۔ دیکھئے کہ آس پاس کس پودے یا جانور کو کھانے پینے کی ضرورت ہے۔ جلد ہی آپ میں ایسی صلاحیت پیدا ہو جائے گی کہ آپ نیچر کو محسوس کرنے لگیں گے اور اسے سننے بھی لگیں گے۔

صاحبو! ہنری کرافورڈ صاحب اپنے بھرپور عقیدوں کے باوجود چند سوالوں پر کلین بولڈ ہو گئے۔ مثلاً نیچر نے جزا اور سزا کا قانون کیا بنایا ہے؟ موت کے بعد کیا ہوتا ہے؟ اگر اخلاقیات صرف ضمیر کا معاملہ ہے تو ہر شخص کی اخلاقیات کا پیمانہ مختلف ہو گا۔ پے گن مذہب حیاتِ انسانی کے لئے اجتماعی نظام کا کیا تصور دیتا ہے۔ اگر خدا بہت سے ہیں تو ان میں مقابلے بازی بھی ہوتی ہو گی۔ بہرکیف امید ہے آپ کو دنیا کے سب سے بڑے مذہب کا جائزہ دلچسپ لگا ہوگا۔ فی امان اللہ!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ابوبکر رانا' لاہور۔

# ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا!

بڑی بڑی شخصیات اس دنیا میں اپنے کارنامے دکھا کر اس جہان فانی سے رخصت ہوگئیں۔ کہ جانا تو سبھی کو ہے۔ اگر حکیم لقمان یا حاتم طائی نے اپنے خلوص قلب سے اس دنیا پر مثبت اثرات چھوڑے تو سکندر اعظم' فرعون اور چنگیز خان نے اپنی بربریت اور انا کی دھوم رہتی دنیا تک انسانیت کے دلوں میں پیوست کر دی اور شک و شبہات کا ایسا جال بچھا گئے جسے مٹاتے مٹاتے اکثریت کو اس زندگی سے نفرت ہی نہیں بلکہ دہشت ہوگئی ہے۔

یہ زندگی سے خوف اور وحشت ہی کا نتیجہ ہے کہ کوئی آگ کے انگاروں پر چل رہا ہے تو کوئی لوہے کے کیلوں پر سو کر زندگی گزار رہا ہے اور کسی نے اپنی ساری عمر ایک گھر کی اندھیری کوٹھڑی میں رہ کر گزار دی۔ یہ خوف اور ہراس ہی کی وجوہات ہیں کہ نفرت اور ہیبت اکثریت کے دل کی گہرائیوں میں اس قدر منجمد ہے کہ آج بھی ہم کسی سائیں یا اللہ لوگ کی درگاہ پر جا کر دیکھ سکتے ہیں۔ جب زندگی سے نفرت کا ماحول پیدا ہو جائے تو اس میں آنے والی مستقبل کی نسلوں کی بھی نفرت ہی میں پرورش ہو رہی ہوتی ہے۔ جس کی وجہ سے فضا میں گھناؤنا پن بڑھتا چلا جاتا ہے اور ایسے معاشرے میں بسنے والوں کی زیادہ اکثریت ذہنی مریض بنتی چلی جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ جھگڑے اور فساد کے علاوہ اور کچھ نہیں رہتا۔ ظاہر ہے کہ جب زندگی میں کوئی جاذبیت ہی نہ رہی تو زندگی دینے والے سے تعلق۔ **چہ معنی دارد؟**

تاریخ کے ایسے ادوار میں جب لوگوں کا ذہن روایات کے پھندوں میں پھنس کر ہولناک فضا بنا رہا ہوتا ہے تو فطرت اپنے کاموں کی تکمیل کے لئے نئے راستے بنا لیتی ہے۔ کہ ہر شب کے بعد خورشید کا جلوہ افروز ہونا قدرت کا اٹل فیصلہ ہے۔ اسی سلسلۂ روز و شب کا التہاب جو ہماری سب کی سانسوں کی آمد و رفت کا بہانہ ہے۔ جب یہ ضو کسی روح شناس کے ذہن کو معطر کرتی ہے تو اس میں امید کا ایک نیا دیا جگمگا اٹھتا ہے۔ اسی سلسلہ روز و شب کی رعنائی نے جب ڈاکٹر اقبال کے خواب آگیں حسِ لطیف کو چھوا تو علامہ کے روایاتی بندھن ایک ایک کر کے پارہ پارہ ہوتے گئے۔ اور جب علامہ نے افکار تازہ کے

جہان میں نت نئے دیوں کا نظارہ دیکھا تو وہ خوف اور بربریت کی تاریکیوں کو بھول گئے اور قرآنی دنیا نے انہیں ایسا آب حیات پلایا کہ اسی کے خمار اور نشے میں ڈوبتے چلے گئے اور یہی پیغام دنیا کو اپنے آخری دم تک مختلف انداز میں سناتے گئے کہ ؎

میرے ساقی نے عطا کی ہے مئے بے درد و صاف
رنگ جو کچھ دیکھتے ہو میرے پیمانے کا ہے

علامہ کے خواب و خیال میں بھی نہیں تھا کہ اس نظارے کو دیکھنے کی خلش نے کسی اور کی زندگی کو بھی مضطرب اور پریشان بنا رکھا ہے اور وہ درویش بھی دنیاوی زندگی سے بیزار ہو کر اپنے دفتر کے کمرہ میں بیٹھا رو رہا ہے کہ ؎

یہ خلش کہاں سے ہوتی جو جگر کے پار ہوتا

جب اس درویش کے کانوں تک آواز پہنچی کہ اس جہانِ رنگ و بو میں ایسا ساقی ابھی بھی موجود ہے جس کا آبِ حیات صاف اور کیف آور ہے تو اس نے اپنے دفتر کے رجسٹر کو بند کیا اور اپنی اضطرابیاں دور کرنے کے لئے علامہ اقبال کی درگاہ تک پہنچ گئے جنہیں اس ساقی کا راز معلوم تھا۔ میں ذکر کر رہا ہوں غلام احمد پرویز صاحبؒ کا۔ جب علامہ اقبالؒ کی چشمِ ژرف بیں کے ٹمٹماتے ہوئے دیئوں کی لو کا رخ پرویز صاحب کی طرف مڑا تو کیف آلود حالت میں انہیں کوئی انسانی شکل دکھائی دی۔ کیف آگیں حالت ان کی اس لئے ہو چکی تھی کہ زندگی کے اواخر میں وہ اس دنیا میں جا چکے تھے جہاں زندگی خراماں خراماں چاند ستاروں کی ٹھنڈک میں خاموشی سے اپنا سفر طے کئے چلی جا رہی ہوتی ہے۔ جہاں:

نہ گلہ ہے دوستوں سے نہ شکایتِ زمانہ
تیری بندہ پروری میں میرے دن گزر رہے ہیں

پرویز صاحب کو اس دنیا کا علم تو ہو چکا تھا لیکن ہنوز فرعونی دنیا کا خوف جہاں سے وہ اٹھ کر آئے تھے ان کے دل میں تذبذب اور قہر آفرینیاں پیدا کر رہا تھا۔ چند نشستیں جب علامہ سے اور ہوئیں تو پرویز صاحب کو اس ساقی کی محفل کا پتہ معلوم ہو گیا جس کے جام صاف، میٹھے اور کیف بار ہوتے ہیں۔ اقبالؒ تو اصلی قرآنی ساقی کا پتہ پرویز صاحب کے ہاتھ میں تھما کر چلے گئے۔ لیکن فرعونوں کی دنیا میں جہاں قدم قدم پر جھوٹ، مکاری، فریب روزمرہ کا معمول ہوتا ہے وہاں ایسے ساقی کا پتہ معلوم کرنے کے لئے تیشۂ فرہاد اور چیتے کا جگر چاہئے۔ جب پرویز صاحب اس ساقی کو ڈھونڈ کر اس کے جام دنیا کو پیش کرنے لگے تو وہی شک و شبہات اور ریت و روایات میں الجھی ہوئی قوم نے ان کو بھی دنیاوی فرقہ بندی میں شامل کر کے پیسے بٹورنے والا سادھو اور سائیں سمجھ لیا۔ لیکن جو اصل صراط مستقیم کی منزل پا چکا ہو اسے کون گمراہ کر سکتا ہے۔ اس ہدایت کا راستہ جس کا وعدہ کائنات کے بنانے والے نے کر دیا اس سے تو کسی بھی ہوش مند کو مفر نہیں ہو

سکتا۔حق و باطل کی جنگ جو اس مفکر قرآن نے قلم کے زور سے لڑی اور علامہ اقبالؒ سے حاصل کیا ہوا وہ اصلی قرآن جس کی تپش اور حرارت نے ان کے روئیں روئیں میں سما کر ان کو انسان کامل کی راہ پر گامزن کر دیا تھا۔ اقبالؒ کی ہمنوائی میں ان کی ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی قرآنی روشنی اس بات کا جیتا جاگتا ثبوت ہے کہ وہ اس قرآن کو پیش کرنے کی جدوجہد کرتے رہے جو الحمد سے الناس تک سراپا علم اور ہر عقل ہوشمند کو غور وفکر کی دعوت پیش کرتا ہے۔ وہ اپنی تقریباً ہر تصنیف میں اس بات کو تحریر میں لاتے رہے کہ ان کے بیان کردہ قرآنی مفہوم ایک انسانی کوشش ہیں جس میں خطا کا ہر ممکن امکان ہے۔ قرآنی معاملات میں کوئی بشر بھی حرفِ آخر کا داعی نہیں بن سکتا۔ جوں جوں انسانی علم میں ارتقاء آتا جائے گا قرآن کے معنی بھی اتنے ہی صاف اور واضح ہوتے چلے جائیں گے۔ جہاں تک اسلام کے نفاذ کا اس دنیا میں ''دین'' کی شکل میں تعلق ہے وہ بھی اس ضمن میں علامہ اقبالؒ کے ہم راز بن چکے تھے۔ افسردگی کی حالت میں علامہ پرویزؒ بھی فروری ۱۹۸۵ء میں اپنی حیات کے اگلے سفر کے لئے روانہ ہوگئے یہ کہتے ہوئے کہ

عشق کی تیغ جگر دار اڑا لی کس نے
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

وہی مولوی جو پاکستان بننے سے پہلے جناحؒ اور اقبالؒ کے پیچھے ہاتھ دھو کر ان کی جان کے درپے تھے اور اس کے بعد علامہ پرویزؒ کی عمر ان کے نشتر برداشت کرتے کرتے گزری۔ آج وہی پھر علم کا ٹھیکہ دار بن بیٹھا ہے اور سادہ طبیعت قوم کو دوبارہ غلام بنانے پر بضد ہے۔ مولوی میں اور خدا کے بندے میں بس اتنا فرق ہوتا ہے کہ خدا کا بندہ انسانوں کو آزادی دلواتا ہے اور مولوی اسے ہمیشہ غلامی کے پھندوں میں پھانسنے کی کوشش میں رہتا ہے! خدا کے بندے خدا کی مخلوق کو کھلی فضا کا سراغ دکھاتے ہیں اور مولوی قوم کو عقل و بصیرت کے خلاف بغاوت پر اکسا کر دوبارہ تنگ و تاریک کوٹھڑوں میں دھکیل دیتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

السلام علیکم رحمۃ اللہ و برکاتہ'

## عنوان = دیہات کی بات

جنگ مورخہ 31/7/05 زیرو پوائنٹ میں/محترم جاوید چودھری صاحب اپنے کالم میں لکھتے ہیں:

یہ خط مجھے گزشتہ روز موصول ہوا' یہ سردار کیناف حسین نے لکھا' یہ خط ایک پورا کالم ہے کیونکہ اس میں وہ سارے ایکسپریشنز موجود ہیں جو کسی اچھے کالم میں ہو سکتے ہیں لہٰذا میں یہ کالم قارئین کی نذر کرتا ہوں۔

کالم کے کچھ حصے ملاحظہ ہوں۔

''آپ تو کالم لکھ کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے ہیں لیکن میرے جیسے بہت سارے وہ لوگ جو سوچ رکھتے ہیں' جو حساس ہیں' وہ کیا کریں؟ کیا ہم لوگ سوچتے رہیں' دیکھتے رہیں اور اندر ہی اندر گھٹتے رہیں یا اس بات پر خوش ہو کر بیٹھ جائیں کہ آپ ہمارے جذبات کی ترجمانی کر رہے ہیں' آپ نے کسی کالم میں عمران خان اور ابرار الحق کو مشورہ دیا تھا وہ اپنی اپنی فیلڈ میں ادارے قائم کریں تا کہ ان کے جانشین پیدا ہو سکیں' کیا آپ بھی کوئی ایسا ادارہ قائم کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں کیا آپ بھی یہ چاہتے ہیں آپ کی سوچ آگے بڑھنی چاہئے''۔

ایک اہم تجویز۔

''چودھری صاحب میرے اس خط کا مقصد کچھ اور تھا اور میں کہیں اور نکل گیا' میرا مقصد صرف یہ ہے کہ کیا ایسا ممکن ہے آپ جیسے لوگ پندرہ بیس ہم خیال لوگوں کا ایک فورم بنا لیں' یہ فورم عام لوگوں کے مسائل حل کرنے کی کوشش کرے' اگر اس فورم نے پچاس میں سے دو لوگوں کا مسئلہ بھی حل کر دیا تو شاید سوسائٹی کی ذمہ داریوں میں ہمارا Contribution ادا ہو جائے۔ بہر حال یہ ایک تجویز ہے اگر کبھی آپ کا اس طرح کا کوئی پروگرام بنے تو مجھے ضرور یاد رکھئے گا''۔

اور غیر سیاسی باتیں/عبدالقادر حسن صاحب جنگ 31/7/05 اپنے کالم میں لکھتے ہیں۔

''میں جو ایک دیہاتی ہوں اور لاہور میں بھی ایک محلے میں رہتا ہوں مقامی پنچایت یونین کونسل یا کسی بھی نام کے ایسے ادارے کے زبردست فائدے جانتا ہوں ح۔ لاہور میں ہمارے محلے کا ممبر ہمارے محلے میں ہی رہتا ہے اور اگر ہمارے حکمران ایسے ممبروں کو آزاد چھوڑ دیں تو میرے محلے کے تمام چھوٹے موٹے جھگڑے اس ممبر کے گھر پر طے ہو جائیں۔ پولیس اور عدالتوں سے جان چھوٹ جائے اور یہ کتنی بڑی نعمت ہے۔ ان سے پوچھئے جن کو ان سے واسطہ پڑتا ہے۔ دیہات میں تو یہ نظام اتنا ضروری ہے کہ جب سرکاری سطح پر یہ نہیں تھا تو دیہاتیوں نے خود ایسا رضا کارانہ نظام قائم کر رکھا تھا۔ یہ ایک قدرتی نظام ہے جس کو حالات اور ضروریات خود بخود جنم دیتی ہیں۔ اگر کوئی حکومت اس نظام کے قانون قاعدے بنا دے اس کی نگرانی اور سرپرستی کرے اور اس کو زیادہ مفید اور موثر بنانے کے لئے فنڈز بھی دے دے تو اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ لیکن ہماری اجتماعی قومی بدنصیبی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ ہم کسی بھی اچھے کام کو برا بنا دینے میں ماہر ہیں۔''

محترم سردار کیناف حسین صاحب' محترم جاوید چودھری صاحب اور محترم عبدالقادر حسن صاحب سے گذارش ہے کہ وہ باغبان ایسوسی ایشن کی طرف آئیں۔ آیئے! ہم بلدیاتی نظام سے دانشوروں کو بھی ساتھ ملا کر کام کریں اور 2006ء کو باغبانی کا سال قرار دیں۔ والسلام۔

**ملک حنیف وجدانی۔ صدر باغبان ایسوسی ایشن۔ سنبل سیداں۔ نیومری۔**